Meri Zaat Zarra-e Be nishan

Umera ahmed

Copied from web

پیش لفظ

کہانی لکھنا بہت آسان کام ہوتا ہے۔ اگر آپ پڑھے لکھے ہیں کاغذ قلم آپ کے پاس ہے اور آپ دنیا میں رہتے ہیں تو آپ کسی بھی وقت ایک عدد کہانی لکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک کہانی کے اچھا یا برا ہونے کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ آپ نہیں کرتے پڑھنے والے کرتے ہیں یعنی دوسرے لوگ۔ جو کہانی...... کہانی کم حقیقت زیادہ لگے وہ اچھی کہانی ہوتی ہے اور جو کہانی بس کہانی ہی لگے وہ بری کہانی ہوتی ہے۔

"میری ذات ذرہ بے نشان" میری پہلی کتاب ہے اور اس میں شامل کہانیاں میری ابتدائی تحریروں میں سے ہیں اچھی ہیں یا بری یہ مجھے نہیں پتہ (کیونکہ میں نے انہیں ہمیشہ جانبداری سے پڑھا ہے) بہر حال ایک چیز پورے دعوے سے کہتی ہوں انہیں میں نے سوچا ہے اور میں نے ہی لکھا ہے۔ میرے لئے یہ تینوں کہانیاں بچے کے پہلے قدم کی طرح ہیں اور بچے کا پہلا قدم کبھی بھی بہت متوازن، ہموار اور مستحکم نہیں ہوتا مگر پہلا قدم اٹھائے بغیر چلنا بھی تو نہیں آتا ان تینوں کہانیوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر کبھی کبھی "عام" چیزوں کو بھی تو دیکھنا اور پڑھنا چاہئے بعض "عام" چیزیں اور باتیں آپ کو بہت "خاص" بننے میں مدد دیتی ہیں۔

اس کتاب کو آپ کے سامنے لانے میں میرا کوئی کردار نہیں ہے۔ اسے شائع کرنے کی خواہش طارق اسمٰعیل ساگر صاحب کی تھی، کہانیوں کا انتخاب ان کی بیٹی نے کیا، مجھے تو کل ثریہ محمود قاضی نے کیا۔ اس لئے آپ کو کتاب پسند آئے تو اس کا کریڈٹ بھی انہی کو جائے گا پسند نہ آنے کی صورت میں ساری ذمہ داری میں اپنے سر لیتی ہوں۔

عمیرہ احمد

دسمبر 1999ء

میری ذات ذرۂ بے نشان

"کیا میں عارفین عباس سے مل سکتی ہوں؟"

بیل بجانے پر ایک لمبا تڑنگا چوکیدار نمودار ہوا تھا اور اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"آپ کون ہیں اور کیوں ملنا چاہتی ہیں ان سے؟"

چوکیدار نے عقابی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے جوابی سوال کیا۔ وہ چند لمحوں کے لئے کچھ بول نہ پائی۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ بوکھلا کر اس نے چوکیدار کو دیکھا تھا اور پھر پتا نہیں کیا خیال آنے پر پرس میں سے وہ خط نکال لیا جو اس کی ماں نے اسے دیا تھا۔

"یہ آپ ان کو دے دیں پھر وہ شاید مجھ سے ملنا چاہیں گے۔"

اس نے خط چوکیدار کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کچھ دیر خط ہاتھ میں لئے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر شاید اسے اس پر ترس آ گیا تھا۔ گیٹ بند کر کے وہ اندر چلا گیا تھا وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پانچ دن پہلے وہ خود بھی عارفین عباس نامی کسی شخص

کو نہیں جانتی تھی۔ وہ اب بھی صرف اس کے نام ہی سے آشنا تھی۔

"عارفین عباس کون ہے؟ امی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ وہ اس کی کیا مدد کرے گا؟"

ان سوالوں کے جواب ابھی اس کے پاس نہیں تھے اور نہ ہی اس نے ان سوالوں کے جواب پانچ دن پہلے ان سے لینے کی کوشش کی تھی جب انہوں نے اپنی زندگی کی آخری رات کو فریج میں لکھا ہوا وہ مختصر خط اور ایک پتا اس کے حوالے کیا تھا۔

"اگر میں مر گئی تو تم اس کے پاس چلی جانا یہاں اکیلے مت رہنا۔"

کئی دنوں کے بعد یہ پہلا اور آخری جملہ تھا جو ان کے منہ سے ادا ہوا تھا۔ انہوں نے پھر منہ لپیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس رات کے بعد وہ دوبارہ انہیں زندہ نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ کچھ دیر حلق میں اٹکے ہوئے سانس کے ساتھ انہیں دیکھتی رہی تھی۔ پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا وہ کنگھی اٹھا کر ماں کے پاس آگئی۔

"امی! میں آپ کے بال بنادوں؟" اس نے گھٹنوں کے بل چارپائی کے پاس بیٹھ کر بڑی بے قراری سے پوچھا تھا۔ آنکھیں کھل گئی تھیں۔ کچھ دیر تک اس پر نظر مرکوز رکھنے کے بعد اس کمزور وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ اثباتی جواب تھا۔ وہ چارپائی پر ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کے بکھرے بالوں کو سمیٹنے لگی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کا دل بار بار بھر آرہا تھا۔ بال سنوارنے کے بعد وہ پیچھے سے اٹھ کر ماں کے سامنے آگئی تھی۔

"دودھ گرم کر دوں؟" اس نے پھر ماں سے پوچھا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ آج تو وہ باتیں کریں۔ اپنے وجود پر چھائی ہوئی خاموشی کا وہ حصار توڑ دیں جس نے کبھی اسے ان کے قریب نہیں ہونے دیا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ اس پر نظریں جمائے دھیرے سے بولی تھیں پھر بڑی آہستگی سے انہوں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں لیا اور اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی انہوں نے اس کا ماتھا چوما ہو۔ آج کیا خاص بات تھی۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور ان کے چہرے کی زردی بھی اس چمک کو ماند کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کے ایک لمس نے اس کے دل میں سے پچھلے کئی برسوں کے گلے شکوے، کدورتیں، ناراضگیاں ختم کردی تھیں۔

"آپ لیٹ جائیں۔" اچانک اسے خیال آیا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔ وہ اسی خاموشی سے لیٹ گئی تھیں۔ رات کو سونے سے پہلے اس نے بہت دیر تک اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھے رکھا تھا۔ دوسری صبح اس نے ناشتے کے لئے انہیں اٹھانا چاہا جب اسے احساس ہوا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔

●

اس نے ایک گہری سانس لے کر گیٹ پر نظریں جمادیں۔ گیٹ کے دوسری طرف سے یک دم قدموں کی آوازیں ابھری تھیں۔ کوئی دروازے کی طرف آرہا تھا۔ وہ دیوار سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ گیٹ میں موجود چھوٹے دروازے کو کھولنے کے بجائے کسی نے بڑی تیزی سے پورے گیٹ کو کھول دیا تھا۔ پچاس پچپن سال کا ایک دراز قد آدمی تھری پیس سوٹ میں اس کے سامنے موجود تھا۔

"سارہ؟" وہ اس شخص کے منہ سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئی تھی۔ کچھ نروس ہو کر اس نے اپنا سر ہلایا تھا۔

"اندر آجاؤ۔" وہ اس شخص کے لہجے کی نرمی پر حیران ہوتے ہوئے گیٹ سے اندر آگئی تھی۔

"تمہارا سامان کہاں ہے؟" اس شخص نے اس کے اندر آتے ہی پوچھا تھا۔

"سامان تو گھر ہی ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا تھا گھر کو باہر سے دیکھنے پر وہ شش و پنج میں تھی۔ اندر آ کر اضطراب میں مبتلا ہو گئی تھی۔

"میں یہاں کیسے رہوں گی؟" بار بار ایک ہی سوال اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آؤ پھر سامان لے آتے ہیں۔" وہ اس کا جواب سن کر بغیر کسی تامل کے پورچ میں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئے تھے۔ وہ کچھ جھجکتی ہوئی ان کے پیچھے آئی۔

"پتا نہیں ان کو وہاں لے جانا ٹھیک ہو گا یا نہیں۔" اس نے سوچا تھا مگر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ گاڑی کا دروازہ کھول چکے تھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کچھ تذبذب کے عالم میں اندر بیٹھ گئی۔

"آپ عارفین عباس ہیں؟" اس نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا تھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر ابھری تھی۔

"ہاں، میں عارفین عباس ہوں۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

"صبا کیسی ہے؟" انہوں نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"صبا!" کچھ غائب دماغی کے عالم میں اس نے نام دہرایا تھا۔ پھر ایک جھماکے کے ساتھ اس کے دماغ کی اسکرین پر اس کا چہرہ ابھرا تھا۔

"امی۔" بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

"ہاں کیسی ہے وہ؟" عارفین عباس گاڑی گیٹ سے باہر نکال چکے تھے۔ وہ چند لمحوں تک چپ رہی۔ گاڑی سڑک پر بڑھاتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر اس سے وہی سوال کیا تھا۔

"امی مر چکی ہیں۔" بے حد دھیمی آواز میں آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

"صبا مر چکی ہے؟" عارفین کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں!" اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ ان کے چہرے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ گاڑی میں کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

"کب؟" آواز اب پہلے کی طرح مستحکم نہیں تھی۔

"پانچ دن پہلے۔" عارفین عباس نے اسٹیرنگ پر ماتھا ٹکا لیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ رو نہیں رہے تھے۔ بس ان کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ فریج میں لکھی ہوئی وہ تحریر اس کی نظروں کے سامنے آ گئی تھی۔

عارفین!

سارہ کو اپنے پاس رکھ لینا۔ اسے میرے خاندان کے پاس مت بھیجنا۔ ماضی دہرانے کی ضرورت نہیں ہے بس اس کا خیال رکھنا۔

صبا

"امی کا ماضی کیا ہو سکتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں۔ اپنی مرضی کی شادی، خاندان کا شادی قبول کرنے سے انکار، ان کا گھر سے چلے جانا، ابو کی موت، امی کا واپس جانا، خاندان سے کوئی رابطہ رکھنا۔" اس نے ہمیشہ کی طرح کڑی سے کڑی ملائی تھی۔ وہ پہیلیاں بوجھنے میں ہمیشہ سے ہی اچھی تھی۔

"لیکن امی کو جان لینا چاہیے تھا کہ میں کبھی بھی بے وقوف نہیں رہی۔" اس نے سوچا۔ "اور یہ شخص جو اس خبر پر اس قدر نڈھال ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے۔ یقیناً امی کو پسند کرتا ہو گا اور امی نے اس سے شادی نہیں کی ہو گی۔ میرے ابو کی وجہ سے اسے ٹھکرا دیا ہو گا۔" اس نے عارفین عباس کی گتھی بھی سلجھا لی تھی۔ "اور اگر امی اس سے شادی کر لیتیں تو ہم کتنی اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن پتا نہیں یہ محبت نام کا عذاب

کیوں چٹ جاتا ہے جو کچھ سوچتے ہی نہیں دیتا۔"

اس نے رنجیدگی سے سوچا تھا۔ عارفین عباس نے اب اسٹیئرنگ سے سر اٹھایا تھا۔ انہوں نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی۔ سارہ کو ان پر بے تحاشا ترس آیا۔ عارفین عباس نے اس سے بہت کچھ چھپایا تھا۔ ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے پتا بتا دیا۔

"آپ امی کے کیا لگتے ہیں؟" اس نے پتا بتاتے ہی ان کے چہرے پر نظر جمائے سوال کیا تھا۔

"وہ میری بھابھی تھی۔" آواز میں شکستگی تھی۔

"امی کے ابو زندہ ہیں؟" اس نے اگلا سوال کیا تھا۔

"امی فوت ہو چکی ہیں، ابو امریکہ میں ہیں۔"

"امی کے کوئی بہن بھائی ہیں؟" اس کی بے تابی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"تمہاری ایک خالہ اور ایک ماموں ہیں۔ وہ دونوں بھی امریکہ میں ہی ہوتے ہیں۔" وہ سڑک پر نظریں جمائے اس کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔

"میرے ابو کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" اس نے جی کڑا کر کے ان سے پوچھ لیا تھا۔

"تمہاری امی نے تمہیں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟" عارفین عباس نے اس بار بھی اسے دیکھے بغیر کہا تھا۔

"بس اتنا کہ ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

اس بار عارفین عباس نے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ "ہاں ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" بے حد عجیب ... میں انہوں نے کہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی، انہوں نے پوچھا تھا۔

"تم پڑھتی ہو؟"

"نہیں۔ گریجویشن کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا اب ایک فیکٹری میں کام کرتی

ہوں۔"

"کیا کام کرتی ہو؟"

"سپروائزر ہوں۔" گاڑی میں خاموشی چھا گئی تھی۔ اس کے فلیٹ تک پہنچنے تک یہ خاموشی قائم رہی۔ گاڑی سے اتر کر اس پرانی تنگ و تاریک عمارت کی سیڑھیاں طے کرتے وہ خاموشی سے اس کی پیروی کرتے ہوئے تیسری منزل پر پہنچ گئے تھے۔ سارہ نے اپنے بیگ سے چابی نکالی تھی اور دروازے پر لگا ہوا تالا کھول کر اندر داخل ہو گئی عارفین عباس بھی اندر چلے گئے تھے۔ سیلن زدہ ایک کمرے کا فلیٹ اپنے مکینوں کی مالی حالت چیخ چیخ کر بتا رہا تھا۔

"آپ بیٹھ جائیں۔" سارہ نے ایک کرسی کھینچ کر ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ عارفین خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کیا آپ مجھے اپنے پاس رکھ سکیں گے؟" وہ سوال جو پورا راستہ وہ ان سے کرنا چاہ رہی تھی مگر کر نہیں پائی تھی اس کی زبان پر آ گیا۔ عارفین عباس اس کی بات پر چونک اٹھے تھے۔

"یہ سوال کیوں کیا تم نے؟"

"میرا مطلب ہے، آپ کی فیملی کو تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟" اس نے اپنی بات واضح کی تھی۔

"میری کوئی فیملی نہیں ہے۔ صرف ایک بیٹا ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر بیگز میں کپڑے اور چیزیں بھرنے میں مصروف رہی۔ سامان پیک کرنے کے بعد اس نے کمرے پر ایک نظر دوڑائی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر چیز اٹھا کر ساتھ لے جاتی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کمرے کی ہر چیز اس گھر میں کاٹھ کباڑ سے زیادہ اہمیت نہیں پا سکے گی۔ اس لئے اس نے صرف اپنے کپڑے اور اپنی

کچھ چیزیں ساتھ لی تھیں۔ عارفین عباس اب کھڑکی میں کھڑے باہر جھانک رہے تھے۔

"کب سے رو رہے ہو تم لوگ یہاں؟" باہر دیکھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔

"ہمیشہ سے۔" انہوں نے اس کے جواب پر مڑ کر اندر دیکھا تھا۔ وہ بیگز اٹھانے لگے تو اس نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ رہنے دیں۔ میں خود اٹھاؤں گی۔"

"تم نہیں اٹھا سکتیں؟" انہوں نے بیگز اس کے ہاتھ سے لے لئے تھے۔

"میں آپ کو کیا کہہ کر پکاروں؟" اس نے انہیں دروازے کی طرف جاتے ہوئے روکا تھا۔ عارفین عباس خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

"جو کہنے میں آسانی ہو۔ کہہ سکتی ہو۔ چاہو تو ـــــ پاپا کہہ سکتی ہو۔" وہ ان کی بات پر گم صم ہو گئی۔ عارفین عباس کمرے سے چلے گئے تھے۔

⁂

"اور کتنی دیر یہاں بیٹھو گی؟" گیٹ کی طرف جاتے جاتے ایک بار پھر اس نے اسے وہاں بیٹھے دیکھا تھا اور وہ اس کی طرف آگیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دی تھی۔

"تم ان سیاہ کپڑوں میں ملبوس اس رات کا ایک حصہ لگ رہی ہو لیکن میں نہیں چاہتا کہ رات کی طرح تم بھی ختم ہو جاؤ۔ اس لئے اب اندر چلی آؤ۔ سردی بڑھ رہی ہے۔" اس کے لہجے میں اس کیلئے وہی نرمی تھی جس کی وہ ہمیشہ سے عادی تھی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے سوال کیا تھا۔

"کچھ کام ہے مجھے، کسی دوست کی طرف جانا ہے۔"

اس نے یونہی کھڑے کھڑے بتایا تھا۔ بات کرتے کرتے اسے لگا جیسے اس نے اس کی بات دھیان سے نہیں سنی۔ وہ پھر سر اٹھا کر پہلے کی طرح آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ

کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ کسی ملکوتی حسن کی مالک نہ تھی پھر بھی کوئی بہت عجیب بہت خاص چیز تھی اس کے چہرے میں۔ مگر کہاں؟ یہ وہ بتا نہیں سکتا تھا۔ "شاید آنکھوں میں یا شاید مسکراہٹ میں ہاں لیکن صبا کچھ ہے ضرور تم میں جس کی میں کبھی وضاحت نہیں کر سکتا۔" عارفین نے ہمیشہ کی طرح اسے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

"اندر جانے کا ابھی بھی کوئی ارادہ نہیں؟" اس نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ جواب اس کی توقع کے برعکس آیا تھا۔

"عارفین! تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟" اس کی نظریں ابھی بھی آسمان پر ہی تھیں۔ عارفین ایک گہری سانس لے کر اس سے کچھ فاصلے پر برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔

"نہیں۔ کیا تم نے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے بھی نہیں دیکھا لیکن میرا دل چاہتا ہے دیکھنے کو۔"

اس کے لہجے میں بچوں جیسا اشتیاق تھا اور چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت، ستون سے سر ٹکائے وہ اب بھی آسمان کو ہی دیکھ رہی تھی۔

"خدا کو کیوں دیکھنا چاہتی ہو صبا؟" عارفین باہر جانے کا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا وہ اس سے بات شروع کرتا پھر ہر کام بھول جاتا۔ دانستہ طور پر بعض دفعہ بھولنا بھی ایک نعمت لگتا ہے۔

"پتہ نہیں کیوں دیکھنا چاہتی ہوں لیکن بس دیکھنا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں عجیب سا اصرار تھا عجیب سی بے چینی تھی۔

"صبا! یہ پوری دنیا اسی کی بنائی ہوئی ہے، اسے دیکھنے کی خواہش ہو تو ہر خوبصورت چیز دیکھو وہ ہر خوبصورت چیز میں نظر آئے گا۔"

اس نے جیسے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی وہ اب اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"صرف خوبصورت چیزوں میں، بدصورت چیزوں میں کیوں نہیں؟ کیا وہ اس نے نہیں بنائیں۔ اسے پھول میں ڈھونڈنا چاہئے کیونکہ پھول خوبصورت ہے، وہ اس میں نظر آئے گا پتھر میں نظر نہیں آئے گا کیونکہ وہ خوبصورت نہیں مگر عارفین! لوگ کہتے ہیں خوبصورتی کسی چیز میں نہیں دیکھنے والی کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ مجھے پھول خوبصورت نہیں لگتا۔ پتھر حسین لگتا ہے تو میں کیا کروں۔" عارفین کی سمجھ میں نہیں آیا اسے کیا جواب دے، بہت سوچ کر اس نے کہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ پتھر بھی خوبصورت نظر آسکتا ہے اور پتھر بھی اس کی بنائی ہوئی چیز ہے تو بس تم دنیا کو دیکھو اور جو چیز تمہیں خوبصورت نظر آئے تم اس میں خدا کو۔۔۔"

مگر عارفین! میں خدا کو چیزوں میں ڈھونڈنا نہیں چاہتی نہ چیزوں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس کو الگ سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایک واحد، جیسا کہ وہ حقیقتاً ہے ہم اچھے کام کریں گے۔ نیکیاں کریں گے۔ اس کی عبادت کریں گے تو کیا ہوگا؟ اس کا اجر ملے گا، جنت مل جائے گی، ہر خواہش پوری ہو جائے لیکن وہ تو پھر بھی نظر نہیں آئے گا۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے۔"

عارفین نے کچھ بے بسی سے اسے دیکھا تھا۔ "پتا نہیں صبا! مگر تم خدا کے بارے میں اتنا مت سوچا کرو پاگل ہو جاؤ گی۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"پھر کس کے بارے میں سوچوں؟" وہ جیسے رہنمائی چاہتی تھی۔

"دنیا کے بارے میں سوچو، ان لوگوں کے بارے میں سوچو جو تمہارے اردگرد رہتے ہیں۔" عارفین نے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا۔

"جو چیز سمجھ میں آگئی ہے، اس کے بارے میں کیا سوچوں، جو سمجھ میں نہیں آ رہی اس کے بارے میں کیوں نہ سوچوں؟"

"صبا! بعض دفعہ تم بہت عجیب باتیں کرتی ہو، ہے نا؟" اس نے عارفین کی بات پر سر جھکا لیا تھا۔

"پتا نہیں۔" کچھ افسردگی سے اس نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے جواب دیا تھا

"تمہاری فرنچ کیسی جارہی ہے؟" عارفین نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں کیسی جارہی ہے، بس کوشش کررہی ہوں۔" وہ بالآخر مسکرائی تھی۔

نہیں خیر، اب ایسا بھی مت کہو، بہت اچھی فرنچ بولنے لگی ہو۔" عارفین نے اس کی ہمت افزائی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اگر واقعی کچھ بہتری ہوئی ہے تو یہ تمہاری وجہ سے ہے۔"

"نہیں خیر، اب ایسا بھی استاد نہیں ہوں میں۔ تمہیں صرف اس لئے یہ زبان سکھانا چاہتا ہوں تاکہ فرانس جاکر تمہیں اجنبیت محسوس نہ ہو ورنہ تم سارا دن خدا کو ڈھونڈتی رہا کرو گی۔" عارفین نے اسے چھیڑا تھا۔

"لیکن میں فرنچ اس لئے سیکھ رہی ہوں تاکہ وہاں کی خواتین کے ساتھ تمہاری گفتگو کو سمجھ سکوں۔"

"خیر، میں ایسا بھی دل پھینک نہیں ہوں۔"

تم نہیں ہو مگر وہاں کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

وہ اس بار اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں صبا کہ اپنا فلیٹ بدل لوں، یہ فلیٹ بینک کے تو قریب ہے لیکن اتنی پرسکون جگہ نہیں ہے، جتنی تم چاہ سکتی ہو، ایک اور فلیٹ دیکھا ہے میں نے بہت خوبصورت جگہ ہے، وہ مل جائے تو تمہیں زیادہ اچھا لگے گا، تمہیں اس کی تصویریں بھجواؤں گا۔ تم دیکھنا اور بتانا کیسا ہے۔"

"واپس کب جارہے ہو؟"

"بس پندرہ بیس دن اور ہیں۔ سرمد کی شادی کے تین چار دن بعد کی فلائٹ

ہے۔" اس نے کار کی رنگ بڑھاتے ہوئے اپنا پروگرام بتایا تھا۔

"اس دفعہ تم گھر میں بہت کم رہے ہو۔ بس کراچی اور اسلام آباد کے چکر ہی لگاتے رہے ہو۔"

"ہاں، اس دفعہ بینک کے بہت سے کام ہیں جو نمٹا رہا ہوں حالانکہ چھٹیاں گزارنے آیا ہوں، لیکن مجھے اس لئے ان کاموں پر کوئی اعتراض نہیں کہ ان کی وجہ سے مجھے سال کے اینڈ پر شادی کے لئے چھٹیاں مل جائیں گی۔ ابھی بھی دو تین دن تک پھر مجھے اسلام آباد جانا ہے اور وہاں سے واپسی شاید ایک دو ہفتے تک ہو۔ تم سناؤ تمہاری یونیورسٹی ٹھیک جا رہی ہے۔" عارفین نے اپنا تفصیلی پروگرام بتا کر اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں ٹھیک جا رہی ہے۔" اس نے شال کو مزید لپیٹا تھا۔

"اب تو کسی کو اعتراض نہیں ہے؟" عارفین نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جن کو اعتراض تھے ان کو اب بھی ہیں اور رہیں گے۔ اعتراض کرنے میں کوئی ٹیکس تو لگتا نہیں ہے کہ کسی کو فکر ہو۔ ہاں بس یہ ہے کہ اب بار بار کہتے نہیں ہیں مجھ سے نہ امی نہ تایا وغیرہ۔ ہاں پردے پر اب بھی اکثر لیکچر دیے جاتے ہیں۔"

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بتاتی جا رہی تھی۔

"ویسے کیا ہے صبا اگر تم پردہ کرو۔ خواہ مخواہ سب کو ناراض کیا ہے تم نے، پھر کچھ مادی کی تو بات ہے پھر فرانس اگر تم جیسے چاہو رہنا۔ چاہو تو اسکرٹ پہننا، چاہو تو ٹراؤزرز مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ اس کے لہجے میں چھپی شرارت بھانپ گئی تھی۔

"میں چادر سے اپنا آپ چھپاتی ہوں۔ میں دوسروں کی طرح بیہودہ لباس نہیں پہنتی ہوں نہ میک اپ کرتی ہوں۔ اگر لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوں تو بھی انہیں وائیں نہیں دکھاتی ہوں۔ ہاں روایتی برقع نہیں لیتی۔ کیا تم کو بھی اس بات پر اعتراض

ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کی بات سن رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے پر، نہ چادر لینے پر۔ میں صرف تمہاری آسانی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ بہت حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے اتنی بہت سی ناراضگی اور مخالفت برداشت کرنے کے لئے۔"

"ہاں اور مجھ میں بہت سا حوصلہ ہے۔ تمہیں تو شاید کہیں جانا تھا۔" صبا کو بات کرتے کرتے اچانک یاد آیا۔

"ہاں جانا تو ہے، خیر پھر آپ کی گفتگو سے فیض یاب ہوں گے۔ اب اگر آپ کو برا نہ لگے تو اندر چلی جائیں۔"

عارفین گھڑی دیکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ صبا نے ایک بار پھر تاروں سے بھرے ہوئے آسمان کو دیکھا تھا پھر وہ کھڑی ہو گئی۔

"خدا حافظ۔" وہ یہ کہہ کر برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے کی طرف چلی گئی۔ عارفین وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

ان کی واپسی بڑی خاموشی سے ہوئی تھی۔ عارفین عباس خاموشی سے گاڑی چلاتے رہے اور وہ باہر کے منظر دیکھتی رہی۔ گھر آنے کے بعد انہوں نے اس کا سامان اتروا کر کسی ملازم کے ہاتھ کسی کمرے میں بھجوا دیا تھا۔

"تم اپنا کمرہ دیکھ لو، تب تک کھانا لگ چکا ہوگا۔"

اسے ان کی بات پر بھوک کا احساس ہوا۔ اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے اور وہ دو بجے یہاں آئی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے کچھ اضطراب، کچھ بے چینی میں نہیں کھایا تھا لیکن اب کھانے کا نام سن کر یکدم اس کی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ ملازم اسے کمرے میں لے آیا تھا۔ وہ کچھ ششدر، کچھ پریشان سی کمرے کو دیکھنے لگی تھی۔ ملازم

اس کا سامان رکھ کر جا چکا تھا۔

"اگر یہ خواب ہے سارہ امین تو دعا کرو یہ خواب بہت لمبا ہو اور اگر یہ حقیقت ہے تو دعا کرو کہ یہ حقیقت کبھی خواب نہ بنے۔"

اس نے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔ قد آدم کھڑکیوں میں سے باہر کا وسیع لان اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔

"کیا اس جگہ رہنا آسان ہوگا۔" اس نے باہر سے نظر ہٹا کر کمرے میں موجود آسائشوں پر ایک تشویش بھری نظر ڈالی تھی۔ اسے وہ سیلن زدہ کمرہ یاد آیا جہاں اس نے اپنی زندگی کے پچھلے چودہ سال گزارے تھے۔ اس کا دل چاہا۔ وہ بھاگ کر واپس چلی جائے۔ "ایلس ان ونڈر لینڈ۔" کسی نے زور سے اس کے کانوں میں کہا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کمرے کو دیکھتی رہی۔ بیڈ سے کارپٹ اور کارپٹ سے سامنے رکھے ہوئے ٹی وی اور فریج تک ہر چیز اس کے لئے بے حد عجیب تھی۔ وہ کتنی ہی دیر یونہی چپ چاپ کمرے کو دیکھتی رہی یک بیک اسے بے حد تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر باتھ روم میں چلی آئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سامنے واش بیسن پر لگا ہوا آئینہ اس کا عکس دکھا رہا تھا۔ اس کی نظر بہت دیر تک آئینے پر مرکوز رہی۔ آئینہ پورے باتھ روم میں جو سب سے بے مایہ چیز دکھا رہا تھا وہ اس کا اپنا وجود تھا۔

"تو سارہ احساس کمتری کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، سو اب تم کیا کرو گی؟" ایک بار پھر کسی نے اس کے کانوں میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بے دلی سے اپنے عکس پر سے نظریں ہٹائیں اور پانی بند کر دیا۔ تولیے سے چہرہ خشک کرنے کے بعد وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے آکر اسے کھانا لگنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہی ڈائننگ میں آ گئی۔ عارفین عباس موبائل پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے موبائل بند کر دیا۔

"آؤ سارہ!" انہوں نے کہا تھا۔ ملازم نے ایک کرسی کھینچ دی تھی۔ وہ کچھ نروس سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے وہ کھانا یاد آیا جو وہ اپنے گھر اپنی امی کے ساتھ کھاتی تھی۔

"سارہ! کھانا شروع کرو۔" عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔

"وہ ڈائننگ ٹیبل پر سب سے سادہ چیز ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔ عارفین عباس نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی اور اس کی پلیٹ میں کچھ چاول نکالے تھے اور پھر آہستہ آہستہ وہ پلیٹ میں مختلف چیزیں رکھتے گئے تھے۔

اس نے جھجکتے ہوئے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔

"یہ پورا گھر تمہارا ہے۔ تم جیسے چاہو یہاں رہو، جو چاہو کرو، ہو سکتا ہے سارا دن بے کار رہ کر تم بور ہو جاؤ۔ اس لئے چاہو تو اپنی اسٹڈیز کا سلسلہ دوبارہ شروع کر سکتی ہو۔"

وہ اس سے بات کرتے ہوئے بھی اس کو نہیں دیکھ رہے تھے بس ہاتھ میں پکڑے ہوئے چمچ کو پلیٹ میں ڈالے ہوئے چاولوں میں پھیرتے رہے۔ اس نے نوٹ کیا تھا۔ وہ کھانا نہیں کھا رہے تھے۔ اس نے جب کھانا ختم کیا وہ تب بھی ان ہی چاولوں کو پلیٹ میں ڈالے ہوئے تھے، شاید وہ صرف مجھے کمپنی دینے کے لئے کھانا کھانے بیٹھے تھے ورنہ انہیں بھوک نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا۔

کھانے کے بعد ملازم نے لان میں چائے لگا دی تھی۔ وہ اسے ساتھ لے کر لان میں آ گئے۔ سارہ نے انہیں چائے بنا کر دی تھی اور ابھی اس نے اپنا کپ ہاتھ میں لیا تھا کہ کسی گاڑی کا ہارن بجا تھا اور چوکیدار گیٹ کھولنے لگا تھا۔

"حیدر آیا ہے۔" عارفین عباس نے گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ سلور گرے کلر کی ایک سوک اندر آئی تھی اور اس میں سے اترنے والے شخص کو دیکھ کر وہ کافی حیران ہوئی تھی۔ اس بندے نے اپنا کوٹ اور بریف کیس دونوں ملازم کو پکڑا دیے تھے۔ اور پھر کار کا دروازہ بند کر کے سیدھا لان کی طرف آیا تھا۔ سارہ اب بھی

حیرانی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے نقوش اور رنگت سے کوئی غیر ملکی لگتا تھا اگرچہ وہ مردانہ وجاہت کا کوئی شاہکار نہیں تھا لیکن دراز قد اور غیر ملکی خدوخال نے اسے کافی مختلف بنا دیا تھا۔ آنے والے نے بھی سارہ کو قدرے حیرانی سے ہی دیکھا تھا۔

"السلام علیکم" قریب آکر حیدر نے کہا تھا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"سارہ! یہ میرا بیٹا ہے حیدر۔" عارفین عباس نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"اور یہ سارہ ہے۔"

"ہیلو!" حیدر نے بہت رسمی سے انداز میں کہا تھا اور پھر بہت شستہ فرنچ میں اس نے باپ سے پوچھا تھا۔ "یہ کون ہیں؟"

عارفین عباس نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا تھا۔

"صبا کی بیٹی ہے۔" کچھ توقف کے بعد حیدر نے ایک بار پھر سوال کیا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہیں؟"

"حیدر! میں تم سے اس سلسلے میں بعد میں بات کروں گا۔" عارفین عباس نے سارہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا جو کسی تاثر کے بغیر چائے پینے میں مصروف تھی۔ وہ جان نہیں سکے کہ وہ فرنچ جانتی ہے یا نہیں۔

"سارہ! تمہیں فرنچ آتی ہے؟"

اس بار انہوں نے اردو میں سارہ سے پوچھا تھا اس نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"نہیں۔" عارفین عباس نے حسب توقع جواب پا کر کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔ حیدر نے چند لمحات میں اس کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا۔

"حیدر کے لئے بھی چائے بناؤ۔" عارفین عباس نے سارہ سے کہا تھا۔ وہ خاموشی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپ رکھ کر اس کے لئے چائے بنانے لگی۔

"اب تو ہم بات کر سکتے ہیں نا۔ آپ بتائیں! یہ یہاں کیوں آئی ہیں؟" حیدر

ایک بار پھر فرنچ میں اپنے باپ سے مصروف گفتگو ہو گیا تھا۔

"حیدر! اب یہ یہیں رہے گی۔"

"کیوں؟" حیدر نے قدرے حیرانی سے پوچھا تھا۔ "چائے لے لیں۔" سارہ نے گفتگو میں مداخلت کی تھی۔ اس نے ایک رسمی سے شکریہ کے ساتھ کپ پکڑ لیا وہ دوبارہ چائے پینے میں مصروف ہو گئی تھی۔

"صبا مر چکی ہے اور یہ اکیلی کیسے رہ سکتی ہے۔" اس بار حیدر نے سارہ کو دیکھا۔

"ان کی ڈیتھ کب ہوئی؟" ایک بار پھر اس نے باپ سے پوچھا تھا۔

"پانچ دن پہلے۔" حیدر نے باپ کو گہری نظروں سے دیکھا تھا وہ اس سے نظر چرا گئے۔ اس نے مزید کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

سارہ فرنچ میں ہونے والی ساری گفتگو سے بے نیاز چائے پیتی رہی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ گفتگو اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جتنی روانی سے وہ دونوں فرنچ بول رہے تھے وہ اتنی روانی سے فرنچ نہیں بول سکتی تھی لیکن بہر حال وہ فرنچ نہ صرف بول لیتی تھی بلکہ اسے اچھی طرح لکھ پڑھ بھی لیتی تھی۔ بچپن میں اس نے ماں کو تنہائی میں بیٹھے یہی زبان بولتے دیکھا تھا۔ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ کون سی زبان بولتی ہیں تب وہ اس زبان کا نام نہیں جانتی تھی اور ہر دفعہ پوچھنے پر امی گم صم ہو جاتی تھیں مگر پھر بعض دفعہ وہ خود ہی خود کلامی میں مگن ہو تیں اور اس کا اشتیاق بڑھتا ہی جاتا پھر وہ جان گئی تھی کہ امی فرنچ بولتی ہیں اور اسے شاک لگا تھا۔

"یہ زبان امی کو کیسے آتی ہے اور اگر یہ زبان آتی ہے تو پھر اور کیا کیا آتا ہے؟"

ان سوالوں نے اس کے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا اور ہر سوال کا جواب امی کی طرف سے ایک خاموشی کی صورت میں ملتا تھا۔ پھر جب اس نے کالج میں داخلہ لیا تو کسی شعوری کوشش کے بغیر ہی اس نے اختیاری مضامین میں فرنچ لے لی تھی۔ وہ امی کے

اسرار کو جاننا چاہتی تھی۔ وہ خود سے کیا بات کرتی ہیں؟ کیا کہتی ہیں؟ کیا سوچتی ہیں۔ بہت آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہو گئی تھی کہ ان کی باتوں کو، ان کے جملوں کے مفہوم کو سمجھ سکے اور جب وہ ایسا کرنے کے قابل ہوئی تو وہ چکرا گئی تھی۔ جب بات سمجھ میں نہیں آتی تھی تب لگتا تھا کہ زبان جاننے کے بعد وہ بات سمجھ جائے گی، جب زبان جاننے لگی تھی تو اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ کبھی ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پائے گی۔ ان کی باتوں میں کہیں بھی ان کا ماضی نہیں جھلکتا تھا۔ کہیں بھی کوئی نام نہیں آتا تھا سوائے ایک نام کے "اللہ"۔ ان کی باتیں اسے ولی کی باتیں لگتی تھیں نہ درویش کی مگر وہ انسان کی باتیں بھی نہیں تھیں۔ کیونکہ انسان کی باتوں میں شکوہ آتا تھا ان کی باتوں میں شکوہ نہیں ہوتا تھا۔

سارہ نے کبھی ان پر ظاہر نہیں کیا کہ وہ فرنچ جاننے لگی تھی۔ وہ اپنی کتابیں ہمیشہ چھپا کر رکھتی۔ اسے ان کی خود کلامی عزیز تھی۔ "خود سے ہی سہی بات تو کرتی تھیں اور اگر جو ان کو پتا چل گیا تو میں اس آواز سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔" وہ انہیں خود کلامی کرتے ہوئے دیکھتی اور سوچتی اور اب یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ حیدر نے فرنچ بولنا شروع کی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان پر یہ ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ یہ زبان جانتی تھی۔ بڑی خاموشی سے تینوں نے چائے ختم کی تھی پھر سب سے پہلے حیدر اٹھ کر اندر گیا تھا۔

"یہ آپ کا اپنا بیٹا ہے؟" سارہ نے اس کے جانے کے بعد ان سے پوچھا تھا۔

"ہاں، یہ میرا اپنا بیٹا ہے۔ میں نے ایک فرنچ عورت سے شادی کی تھی۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"تین سال پہلے اس کی ڈیتھ ہو گئی۔" اس نے عارفین عباس کے چہرے کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔

"میری امی نے فرنچ کہاں سے سیکھی تھی؟"

عارفین عباس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اسے شوق تھا۔" وہ اس ادھورے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ تم چاہو تو گھر کو دیکھ لو یا پھر آرام کرو۔"

وہ شاید اس کے اور کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اٹھ کر اندر آ گئے تھے۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ اٹھ کر لان میں پھرنے لگی۔ عارفین عباس نے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ یکدم بے تحاشا تھکن ان کے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ دراز میں سے چابیاں نکالنے کے بعد انہوں نے وارڈروب کھولی تھی اور اس کے اندر کہیں سے کچھ البم نکال کر بیڈ پر آ گئے تھے۔ البم کھولتے ہی وہ چہرہ ان کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ جس کی قبر پر کچھ دیر پہلے وہ سارہ کے ساتھ فاتحہ پڑھ کر آئے تھے۔

"تو بس دنیا میں تم صرف چھیالیس سال گزارنے آئی تھیں اور میں خوش ہوں صبا! میں آج بہت خوش ہوں کہ تمہیں زندگی کے عذاب سے نجات مل گئی اب کم از کم تم سکون سے تو ہو گی۔" وہ اس کی تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔

صبا ان کی چچازاد تھی۔ وہ دو بہنوں اور ایک بھائی میں سب سے بڑی تھی اور عارفین اپنی تینوں بہنوں سے چھوٹے اور اکلوتے تھے۔ ایک ہی بڑے سے احاطے میں ان چاروں بھائیوں کے چار کونوں میں گھر تھے اور چاروں گھروں کے درمیان کا وسیع صحن مشترکہ تھا۔ گھروں کے بیرونی طرف چاروں جانب لان تھا۔ گھروں کی بیرونی

دیوار اور گیٹ بھی مشترکہ تھا۔ عارفین کے ابو سب سے بڑے تھے اور صبا کے والد بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

صبا کے ابو شروع سے امریکہ میں مقیم تھے اور دو سال میں دو بار پاکستان آیا کرتے تھے۔ لیکن صبا کی فیملی نے کبھی باہر شفٹ ہونے کی کوشش نہیں کی کیونکہ نہ تو اس کے ابو ان لوگوں کو باہر لے جانا چاہتے تھے اور نہ ہی خود صبا کی امی باہر جانا چاہتی تھیں۔ وہ اتنی دور نہیں رہ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے بعد وہ اسی گھر میں ایک الگ حصے میں منتقل ہو گئیں۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ یہ گھرانہ ایسا تھا جہاں لڑکیوں کو بس اتنی تعلیم دی جاتی تھی جس سے انہیں لکھنا پڑھنا آجاتا۔ صبا کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ حیران ہوئی تھی جب بڑے تایا نے اسے گھر بیٹھنے کے لئے کہا۔ امی کی بھی یہی رائے تھی کہ اتنی تعلیم لڑکیوں کے لئے کافی ہوتی ہے۔

"نہیں۔ مجھے تو آگے پڑھنا ہے اور میں ابو سے بات کرلوں گی لیکن میں تعلیم نہیں چھوڑوں گی۔"

اس کے دوٹوک جواب پر اس کی امی سکتے میں آگئی تھیں۔

"گھر میں کوئی اس بات کو پسند نہیں کرے گا اور خود تمہارے ابو بھی۔ پھر تمہیں پڑھ کر کرنا بھی کیا ہے۔" اس کی امی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"پڑھنا لکھنا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو اعتراض ہونا چاہئے۔ اور مجھے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد طے کروں گی۔ ابھی کیسے بتادوں۔"

اس نے بڑے سکون سے کہا اور پھر پتا نہیں اس نے اپنے باپ کو کیا لکھ کر بھیجا تھا کہ انہوں نے اسے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی تھی۔

عارفین ان دنوں لندن اسکول آف اکنامکس میں اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ وہ عمر میں صبا سے پانچ سال بڑا تھا۔ اپنی دوسری کزنز کی طرح اس نے صبا پر بھی کبھی دھیان

نہیں دیا تھا۔ صبا سے اس کی پہلی باقاعدہ ملاقات تب ہوئی تھی جب تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے ایک بینک میں جاب کرلی تھی اور چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ باری باری ہر چچا کے گھر گیا تھا۔ صبا ان دنوں ایف۔ اے میں داخلہ لینے کی کوششوں میں تھی۔ عارفین کے لئے چائے وہی لائی تھی اور چائے کا کپ دیتے ہی اس نے عارفین سے پوچھا تھا۔

"تعلیم کیسی چیز ہوتی ہے؟"

عارفین اس سوال پر قدرے حیران ہوا تھا۔ "بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔"

"صرف لڑکوں کے لئے یا لڑکیوں کے لئے بھی؟" سوال کا جواب ملتے ہی ایک اور سوال پوچھا گیا تھا۔

"صبا! کیا فضول سوال جواب شروع کر دیے ہیں۔" صبا کی امی نے اسے ٹوکا تھا۔

"دونوں کے لئے ہی اچھی ہے۔" عارفین نے چچی کی بات پر غور کئے بغیر اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

"پھر تایا تعلیم کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟ اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیتے ہیں اور دوسروں کو گھر سے باہر تک جانے نہیں دیتے۔"

"صبا! منہ بند کرلو۔ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ عارفین! تم اس کی بات پر دھیان مت دینا۔" صبا کی امی نے کچھ گھبرا کر عارفین سے کہا تھا جو کافی دلچسپی سے صبا کو دیکھ رہا تھا۔

"کس کو گھر سے باہر جانے سے روک دیا؟"

"مجھے۔" اس کے سوال کا فوراً جواب آیا تھا۔

"صبا بی بی! آپ تو پہلے ہی ایف۔ اے کر چکی ہیں۔ آگے اور کیا پڑھیں گی اور پھر پڑھ کر آپ کو کرنا بھی کیا ہے؟"

آپ اتنا پڑھ کر کیا کریں گے؟" لہجہ ابھی بھی نرم تھا لیکن سوال نہیں۔

"بھئی۔ میں تو مرد ہوں۔ مجھے تو کمانا ہے تا کہ گھر چلا سکوں۔" اس نے کچھ شگفتگی سے کہا تھا۔

"اتنی زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا واحد مقصد کمانا تھا؟" عارفین اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"بہر حال، میں کمانے کے لئے تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی۔ شعور حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"شعور حاصل کر کے کیا کریں گی؟" عارفین نے بے اختیار پوچھا تھا۔

"دنیا کو سمجھوں گی۔ انسانوں کو جانچوں گی۔"

عارفین نے کچھ حیرانی سے اپنی اس کزن کا چہرہ دیکھا تھا۔

"آپ بی۔اے میں داخلہ لینا چاہتی ہیں۔ ضرور لیں۔ میں ابو سے بات کر لوں گا۔ وہ اعتراض نہیں کریں گے۔"

عارفین نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ اندر چلی گئی تھی۔

چچی ناراض ہونے لگی تھیں، انہیں سمجھانے میں عارفین کو کافی وقت لگ گیا تھا۔ پھر واقعی تایا نے پچھلی بار کی طرح اس بار مخالفت نہیں کی تھی لیکن یہ نہیں تھا کہ انہیں صبا کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ان کے اعتراضات اور ناپسندیدگی اپنی جگہ پر تھی اور انہوں نے اب صبا سے بات کرنا ہی چھوڑ دی تھی۔ صبا کو خود بھی اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

"امی! مجھے لوگوں سے تعریف پا کر کرنا بھی کیا ہے۔ مجھے کوئی پسند کرے تو اس کا مجھے کیا فائدہ ہے؟ ناپسند کرے تو اس کا مجھے کیا نقصان ہے؟ ہاں بس میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی میری تعلیم میں مداخلت نہ کرے۔"

اس کی منطق، اس کی فلاسفی اس کی امی کی سمجھ سے باہر تھی۔ انہیں تو ہر وقت یہ ہی دکھ لگا رہتا تھا کہ ابھی تک صبا کے لئے خاندان میں سے کسی نے پیغام نہیں دیا اور صبا کی حرکتوں کو دیکھ کر انہیں یہ ممکن لگتا بھی نہیں تھا۔

پھر اس وقت عارفین کے ماں باپ پر بجلی گر پڑی تھی جب عارفین نے صبا کے لئے پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ پورے خاندان کی نظریں جس پر لگی ہوئی تھیں اسے پسند آئی بھی تو بقول تائی امی ایک "رسوائے زمانہ" لڑکی۔ تائی امی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ صبا کو گولی مار دیں۔ یہی حال تایا کا تھا۔ صبا انہیں ہی سب سے زیادہ ناپسند تھی اور اب اسے بہو بنانا انہیں قیامت سے بھی زیادہ دشوار لگ رہا تھا۔ عارفین کو سمجھانے میں وہ ناکام رہے تھے۔ وہ کبھی ضد نہیں کرتا تھا مگر اس بار وہ اپنی بات پر اڑ گیا تھا۔ اسے صبا کی کسی بات میں کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ وہ اس کی تعلیم کو اس کی خوبی قرار دے رہا تھا۔ تایا اس پر زیادہ سختی نہیں کر سکتے تھے۔ آخر وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بھی لائق فائق۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دل پر جبر کرتے ہوئے صبا کا رشتہ مانگ لیا تھا۔

"امی! عارفین سے پوچھیں۔ آگے پڑھنے دیں گے؟ اگر اقرار کریں تو پھر مجھے اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

صبا نے اس رشتہ پر اپنے رد عمل کا اظہار ایک جملہ میں کیا تھا۔ صبا کی امی سر پیٹ کر رہ گئی تھیں۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ صبا کا دماغ خراب ہو چکا ہے ورنہ وہ اتنے اچھے رشتے پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے شرطیں نہ رکھتی۔ انہوں نے عارفین تک اس کا جواب پہنچا دیا تھا اور عارفین کو واقعی اس کی تعلیم پر کوئی اعتراض نہیں تھا نہ ہی وہ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے سے روکنا چاہتا تھا۔

بڑی سادگی سے نسبت طے کرنے کے بجائے دونوں کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ رخصتی

دو سال بعد ٹھہرائی گئی تھی۔

صبا نے ایک بار پھر سب کو ناراض کرتے ہوئے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا اس بار اعتراضات اس لئے بھی زیادہ ہوئے تھے کیونکہ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور خاندان بھر کو یہ سوچ کر ہی طیش آرہا تھا کہ ان کے خاندان کی لڑکی اب لڑکوں کے ساتھ پڑھے گی۔ تایا جب اسے یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے نہیں روک سکے تو انہوں نے شرط عائد کر دی تھی کہ وہ برقع اوڑھ کر یونیورسٹی جایا کرے کیونکہ وہ ان کے خاندان کی بہو ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ وہ اس طرح بے حیاؤں کی طرح منہ کھولے لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہے۔ مگر ہر بات کی طرح اس بار بھی صبا کی منطق نرالی تھی۔ "میں تعلیم حاصل کرنے جارہی ہوں اور مجھے اپنی عزت کا پاس ہے۔ اور میں یونیورسٹی بے پردہ نہیں جارہی ہوں۔ چادر لے کر جاؤں گی۔ میرا سر اور جسم اس چادر میں چھپا رہے گا مگر میں روایتی برقع نہیں پہنوں گی اور اگر پہنوں گی بھی تو گھر سے پہن کر جاؤں گی اور دوسری لڑکیوں کی طرح یونیورسٹی جا کر اتار دوں گی۔ ایسے برقع کا ہمارے خاندان کو کیا فائدہ ہوگا۔"

تایا اور تائی اس کی ضد پر تلملا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے عارفین کو خط لکھ لکھ کر اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی مگر ایسے لگتا تھا جیسے فرانس جا کر عارفین بھی اس کا ہمنوا ہو گیا تھا۔ وہ ان کے پانچ خطوں کے جواب میں ایک خط لکھتا اور وہ بھی اس بات کے ساتھ کہ صبا اگر برقع نہیں پہننا چاہتی تو نہ پہنے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہی بات وہ صبا کو بھی خط میں لکھ رہا تھا۔

دونوں کے درمیان مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی تھی مگر یہ خطوط کوئی روایتی قسم کے خطوط نہیں تھے۔ ان میں اقرار محبت اور اظہار محبت کے علاوہ سب کچھ ہوتا تھا اور شاید ان دو چیزوں کی دونوں کو بھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ صبا کا خط

عارفین کو کتاب کی طرح لگتا تھا۔ ہر لفظ کوئی نیا مفہوم، کوئی نیا معنی لئے ہوتا تھا وہ پڑھتا۔ کچھ جملوں پر حیران ہوتا کچھ پر سکتے میں آتا۔ کچھ پر اس کی سانس رک جاتی۔ خط دوبارہ پڑھتا تو کوئی دوسرا جملہ کسی دوسری دنیا کا دروازہ اس پر کھول دیتا۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا، وہ صبا سے کہہ دے۔ "چیزوں کے بارے میں ایسے مت سوچو ورنہ زندگی گزارنا بہت مشکل ہو جائے گی۔" ہر دفعہ وہ صرف سوچ کر رہ جاتا۔ اسے کبھی لکھ نہیں پاتا، اس میں اتنی جرات ہی نہیں تھی۔ بعض دفعہ اس کا دل چاہتا۔ وہ اس سے کہے کہ ہر چیز کے بارے میں سوچتی ہو، مجھے لکھ دیتی ہو۔ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو، یہ کیوں نہیں لکھتیں؟

ایک بار اس نے ہمت کر کے یہ سوال اسے لکھ ہی دیا تھا۔ اسے اس کا جواب ابھی تک یاد تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"جس چیز سے بے حد محبت ہو، اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہئے۔ سوچ شبہات کو پیدا کرتی ہے اور شبہ محبت کو ختم کر دیتا ہے۔ تم چاہتے ہو، تم سے میری محبت ختم ہو جائے؟"

وہ دوبارہ اس سے اپنے بارے میں کچھ جاننے کی فرمائش نہیں کر سکا تھا۔

❁

"سارہ! میں پرسوں صبا کے لئے قرآن خوانی کروا رہا ہوں۔ سب خاندان والے آئیں گے اور بھی کافی لوگ ہوں گے۔ میں نے ملازمین سے کہہ دیا ہے وہ سارے انتظامات دیکھ لیں گے مگر پھر بھی تم خود ان کی نگرانی کرنا۔"

صبح ناشتہ پر عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔ حیدر نے باپ کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ رات کو سوئے نہیں تھے۔ وہ ان سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے ایک نظر سارہ پر ڈالی۔ وہ چائے کے کپ کے

گڑ رہا تھا جمائے کسی سوچ میں گم تھی۔ چند لمحوں تک اس نے سارہ کے چہرے پر نظر جمائے رکھی۔ نامحسوس طور پر اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے چہرے کے نقوش بہت دلکش تھے۔ خاص طور پر دراز پلکوں والی آنکھیں۔ "اس کی امی بھی اسی کی طرح ہوں گی ورنہ پاپا جیسے شخص کو محبت جیسا روگ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر کیا صرف اچھی شکل کی وجہ سے پاپا ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ کیا ممی سے زیادہ خوبصورت تھیں وہ؟" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا۔ یکدم اس نے سارہ کو چونکتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً اسے لاشعوری طور پر احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

حیدر نے بڑے سکون سے اپنی نظر ناشتے کی پلیٹ پر مرکوز کر لی۔ سارہ نے عارفین عباس کو دیکھا۔ وہ بریڈ پر جیم لگا رہے تھے پھر اس نے حیدر کو دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے اپنی پلیٹ پر جھکا چھری سے انڈے کو کاٹنے اور کانٹے سے اسے کھانے میں مصروف تھا۔ وہ ایک بار پھر سوچوں میں گم ہو گئی۔

"عارفین عباس کو تو امی سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر باقی خاندان والوں کا ردعمل کیا ہو گا؟"

یہ سوال تھا جو بار بار اسے تنگ کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی کہ اسے امی کے خاندان والوں کا سامنا کرنا ہو گا۔

اس دن وہ کافی بے چین رہی۔ دوپہر کو عارفین گھر نہیں آئے تھے نہ ہی حیدر آیا تھا۔ عارفین نے اسے فون کر کے لنچ کرنے کے لئے کہہ دیا۔ اسے عجیب سی آزادی کا احساس ہوا تھا۔ اس نے بھی دوپہر کا کھانا نہیں کھایا بلکہ دالان میں آ کر بیٹھ گئی۔

"میرے ابو میں ایسی کون سی خاص بات تھی جو امی نے عارفین عباس جیسے شخص کو چھوڑ دیا۔ وہ یہاں اچھی زندگی گزار سکتی تھیں۔ اس زندگی سے بہت بہتر جو انہوں نے وہاں گزاری۔"

اسے بار بار وہ سیلن زدہ ایک کمرے کا فلیٹ یاد آ رہا تھا۔ جو برسات میں بہت سی جگہوں سے ٹپکتا اور وہ بہت دل گرفتگی سے پانی کے ان قطروں کو دیکھتی رہتی جو آہستہ آہستہ پورے کمرے کو گیلا کر دیتے۔

"اگلی دفعہ برسات سے پہلے کچھ روپے جمع کر کے اس کی مرمت کروالیں گے۔" ہر برسات میں وہ اپنی امی سے یہی کہتی مگر کبھی بھی اتنے پیسے جمع نہیں ہو پائے جس سے وہ اس چھت کی مرمت کروا پاتے۔ صرف سارہ تھی۔ جو اس فلیٹ اور وہاں موجود چیزوں کی حالت کے بارے میں فکرمند رہتی تھی ورنہ اس نے اپنی امی کو کبھی ان چیزوں کے بارے میں پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ہاں شاید وہ اگر کسی چیز کی پروا کرتی تھیں تو وہ سارہ کا وجود تھا۔ اسے یاد تھا۔ وہ بچپن میں اسے خود اسکول چھوڑنے جاتیں اور پھر اسکول سے لے کر آتیں۔ انہوں نے کبھی بھی اسے دوسرے بچوں کے ساتھ کہیں آنے جانے نہیں دیا تھا۔ سارہ کو اسکول سے لے کر وہ سیدھا اپنی فیکٹری چلی جاتی تھیں۔ جہاں وہ ریڈی میڈ کپڑوں کی پیکنگ کیا کرتی تھیں اور سارہ وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر اسکول کا ہوم ورک کرتی اور بعض دفعہ تھک جانے پر وہیں ایک طرف سو جاتی۔

اس نے اپنی امی کو فیکٹری میں بھی کبھی کسی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کا پورا دھیان صرف اپنے کام پر ہوتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سارہ نے کبھی اپنی ماں کو کسی کی جھاڑ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ایک مشین کی طرح کپڑوں کو لفافوں میں اور بعد میں ڈبوں میں بند کرتی تھیں اور سارہ کو یہ سب ایک دلچسپ کھیل کی طرح لگتا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑی ہوتی گئی تھی اور اس کھیل سے اسے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ ابھی بھی وہ اسکول سے ماں کے ساتھ ہی فیکٹری چلی جاتی تھی اور میٹرک تک اس کی یہی روٹین رہی۔

میٹرک کے بعد اس نے اپنی امی سے کہا تھا کہ وہ پڑھنے کے بجائے کوئی کام کرنا

چاہتی ہے مگر امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا مگر وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔ امی کی صحت آہستہ آہستہ خراب ہو رہی تھی اور ہر گزرتا دن اسے خوفزدہ کر دیتا تھا وہ فورتھ ایئر میں تھی جب اس کی امی بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ وہ کام پر نہیں جا پاتی تھیں۔

چند ماہ تک جوں توں کر کے جمع پونجی سے گھر چلایا گیا پھر بی۔ اے کے پیپر زدینے کے بعد سارہ نے اسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام شروع کر دیا تھا جہاں اس کی امی کام کرتی تھیں۔

فیکٹری اس کے گھر کے قریب تھی اور وہاں جاب حاصل کرنے کے لئے اسے کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ عرصہ کے بعد امی کی حالت ٹھیک ہو گئی تھی اور انہوں نے دوبارہ فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ سارہ نے ان کے اصرار پر جاب چھوڑ دی تھی اور ایک بار پھر سے پرائیویٹ طور پر اکنامکس میں ایم۔ اے کی تیاری شروع کی تھی مگر آٹھ نو ماہ بعد پھر امی پہلے کی طرح بیمار پڑ گئیں اور اس بار وہ کافی عرصہ تک بیمار رہیں۔ سارہ نے ایک بار پھر اسی فیکٹری میں جاب کر لی تھی اور پھر امی کے ٹھیک ہونے اور ان کے اصرار کے باوجود اس نے جاب نہیں چھوڑی۔ فیکٹری سے اسے اتنے روپے مل جاتے تھے جس سے فلیٹ کا کرایہ اور باقی اخراجات پورے ہو جاتے تھے اور سارہ کے لئے یہ کافی تھا۔

کسی دوسری جگہ پر اس نے جب بھی جاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گارنٹی کا مسئلہ اس کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آتا اور اب اسے جاب کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر سر کرسی سے ٹکا دیا۔

❁

حیدر کل کی طرح آج بھی چار بجے آیا تھا اور لان کی طرف آنے کی بجائے اندر چلا

گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد سارہ نے ایک بار پھر اس کو ٹریک سوٹ میں ملبوس باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور پھر اس کی واپسی رات کو ہوئی تھی۔

عارفین عباس بھی رات کو ہی آئے تھے۔ کھانے کی میز پر حیدر اور عارفین کے درمیان فرنچ میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ دونوں اپنی جاب کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سارہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے دوران ایک بار پھر سارہ کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر عارفین اور حیدر کو دیکھا۔ دونوں اب بھی پہلے ہی کی طرح مصروف گفتگو تھے۔ وہ ایک بار پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ کھانے کی میز سے سب سے پہلے حیدر گیا تھا۔

"کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تمہیں؟" عارفین عباس نے اس کے جانے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"شوق کا مجھے پتا نہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی کتاب ملتی ہے تو اسے پڑھ ضرور لیتی ہوں۔" عارفین عباس کی نظر لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر ٹک گئی تھی۔ اس وقت وہ انہیں بالکل صبا کی طرح لگی تھی۔

"اسٹڈی روم دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں۔"

"دیکھنا۔ وہاں کافی کتابیں ہیں۔ انہیں پڑھنے سے تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔"

وہ نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❁

دوسرے دن ایک ملازم سے پوچھ کر وہ اسٹڈی میں آئی تھی۔ اسٹڈی میں واقعی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں پنجابی، اردو، انگلش اور فرنچ چاروں زبانوں

چاہتی ہے مگر امی نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا مگر وہ زیادہ خوش نہیں تھی۔ امی کی صحت آہستہ آہستہ خراب ہو رہی تھی اور ہر گزرتا دن اسے خوفزدہ کر دیتا تھا وہ فورتھ ایئر میں تھی جب اس کی امی بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ وہ کام پر نہیں جا پاتی تھیں۔

چند ماہ تک جوں توں کر کے جمع پونجی سے گھر چلایا گیا پھر بی۔ اے کے پیپر زدینے کے بعد سارہ نے اسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام شروع کر دیا تھا جہاں اس کی امی کام کرتی تھیں۔

فیکٹری اس کے گھر کے قریب تھی اور وہاں جاب حاصل کرنے کے لئے اسے کسی گارنٹی کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچھ عرصہ کے بعد امی کی حالت ٹھیک ہو گئی تھی اور انہوں نے دوبارہ فیکٹری جانا شروع کر دیا تھا۔ سارہ نے ان کے اصرار پر جاب چھوڑ دی تھی اور ایک بار پھر سے پرائیویٹ طور پر اکنامکس میں ایم۔ اے کی تیاری شروع کی تھی مگر آٹھ نو ماہ بعد پھر امی پہلے کی طرح بیمار پڑ گئیں اور اس بار وہ کافی عرصہ تک بیمار رہیں۔ سارہ نے ایک بار پھر اسی فیکٹری میں جاب کر لی تھی اور پھر امی کے ٹھیک ہونے اور ان کے اصرار کے باوجود اس نے جاب نہیں چھوڑی۔ فیکٹری سے اسے اتنے روپے مل جاتے تھے جس سے فلیٹ کا کرایہ اور باقی اخراجات پورے ہو جاتے تھے اور سارہ کے لئے یہ کافی تھا۔

کسی دوسری جگہ پر اس نے جب بھی جاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گارنٹی کا مسئلہ اس کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آتا اور اب اسے جاب کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لے کر سر کرسی سے ٹکا دیا۔

❁

حیدر کل کی طرح آج بھی چار بجے آیا تھا اور لان کی طرف آنے کی بجائے اندر چلا

گیا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد سارہ نے ایک بار پھر اس کو ٹریک سوٹ میں ملبوس باہر آتے دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا اور پھر اس کی واپسی رات کو ہوئی تھی۔

عارفین عباس بھی رات کو ہی آئے تھے۔ کھانے کی میز پر حیدر اور عارفین کے درمیان فرنچ میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ دونوں اپنی جاب کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ سارہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کھانے کے دوران ایک بار پھر سارہ کو کسی کی نظروں کی تپش کا احساس ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر عارفین اور حیدر کو دیکھا۔ دونوں اب بھی پہلے ہی کی طرح مصروف گفتگو تھے۔ وہ ایک بار پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئی۔ کھانے کی میز سے سب سے پہلے حیدر گیا تھا۔

"کتابیں پڑھنے کا شوق ہے تمہیں؟" عارفین عباس نے اس کے جانے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"شوق کا مجھے پتا نہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی کتاب ملتی ہے تو اسے پڑھ ضرور لیتی ہوں۔" عارفین عباس کی نظر لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر ٹک گئی تھی۔ اس وقت وہ انہیں بالکل صبا کی طرح لگی تھی۔

"اسٹڈی روم دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں۔"

"دیکھنا۔ وہاں کافی کتابیں ہیں۔ انہیں پڑھنے سے تمہارا وقت اچھا گزر جائے گا۔"

وہ نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❁

دوسرے دن ایک ملازم سے پوچھ کر وہ اسٹڈی میں آئی تھی۔ اسٹڈی میں واقعی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس میں پنجابی، اردو، انگلش اور فرنچ چاروں زبانوں

میں کتابیں موجود تھیں۔ وہ کچھ دیر تک مختلف کتابیں نکال نکال کر دیکھتی رہی۔ پھر ایک کتاب نکال کر بیٹھ گئی۔

دوپہر تک وہ وہیں اسٹڈی میں رہی۔ پھر اس نے ڈائننگ روم میں آکر لنچ کیا۔ عارفین اسے بتا چکے تھے کہ وہ لنچ آفس میں ہی کرتے ہیں اور حیدر بھی لنچ کرنے گھر نہیں آتا تھا۔ لنچ کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر اسٹڈی میں آگئی تھی۔ اس بار وہ اپنے کمرے سے اپنی ڈائری اٹھا لائی تھی اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے وہ قلم اٹھایا جس نے اسٹڈی میں آتے ہی اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کا ایک فاؤنٹین پین تھا جس کی نب کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈز لگے ہوئے تھے۔ سونے سے بنی ہوئی نب بھی اسے بہت پرکشش لگ رہی تھی۔

قلم ہاتھ میں لے کر اس نے ایک شاعری کی کتاب سے کچھ اشعار اپنی ڈائری میں اتارنے شروع کر دیے۔ قلم اتنی خوبصورتی، نفاست اور روانی سے لکھ رہا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت دیر تک اس سے لکھتی رہی تھی۔ اس کی توجہ تب ہٹی تھی جب کوئی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر آیا تھا سارہ نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تھا۔ آنے والا حیدر تھا۔

وہ خود بھی خلاف توقع اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ چند لمحے وہ یونہی دروازے کا ہینڈل پکڑے کھڑا رہا پھر وہ دروازہ بند کر کے تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ اس کے بالکل قریب آکر وہ جھکا تھا اور باری باری اس نے اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھولنے شروع کر دیے تھے۔ سارہ کا سانس حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ حیدر نے ایک دراز میں سے کچھ پیپرز نکالے تھے پھر اس نے اسٹڈی ٹیبل کے ایک کونے میں رکھی ہوئی کچھ کتابیں اٹھائی تھیں۔

"Please give me my pen" (پلیز میرا قلم دے دیں) اس نے

سیدھا ہونے کے بعد سارہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کی طرف اشارہ کیا تھا اور ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔

سارہ نے بے اختیار پین کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسے حیدر کے ہاتھ میں پکڑانے کے بجائے ٹیبل پر پڑی ہوئی اس ڈبیا میں رکھ دیا جس میں سے اس نے اسے نکالا تھا۔ حیدر نے اس کی اس حرکت پر کچھ عجیب سے تاثرات سے اسے دیکھا تھا اور پھر ٹیبل پر پڑی ہوئی وہ ڈبیا اٹھا کر اسٹڈی سے باہر چلا گیا۔ سارہ کی جان میں جان آگئی تھی۔

"اور اگر یہ کوئی بدتمیزی کرتا تو میں کیا کرتی؟" وہ بے حد فکر مند تھی۔

پچھلے تین دن سے حیدر کے رویے نے اسے پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ سارا دن گھر سے باہر ہوتا تھا اور رات کو کھانے کے بعد اوپر چلا جاتا۔ جتنی دیر وہ اس کے سامنے ہوتا وہ اس کو نظر انداز کیے رکھتا تھا اور سارہ کو یہ بات پسند تھی لیکن اس وقت وہ پریشان ہو رہی تھی۔

"کیا امی کو پتا تھا کہ وہ جہاں مجھے بھیج رہی ہیں۔ وہاں عارفین عباس کا بیٹا بھی ہوگا اور وہاں کوئی دوسری عورت نہیں ہوگی اور گھر کا ملازم مجھے اس کے ساتھ اکیلا دیکھ کر کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ میں دوبارہ کبھی بھی اسٹڈی میں نہیں بیٹھوں گی۔" اس نے یکدم خود ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

❁

"صبا! بعض دفعہ تم مجھے بہت Embarras (شرمندہ) کر دیتی ہو۔" اس روز عارفین کا موڈ خاصا خراب تھا۔

"تم آج پھر یونیورسٹی آگئے ہو؟" صبا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

"میں نے ایسا کب کہا۔"

"امی نے کل مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یونیورسٹی تم سے ملنے گیا ہوں میں نے کہہ دیا نہیں۔ انہوں نے میری بات کی تصدیق کے لئے تم سے پوچھا اور تم نے صاف کہہ دیا کہ ہاں میں یونیورسٹی آیا تھا۔"

"عارفین! اس میں چھپانے والی کون سی بات تھی؟" صبا کے لہجے میں اطمینان برقرار تھا۔

"بات سچ جھوٹ کی نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے۔ امی کو میرا تم سے ملنا پسند نہیں ہے۔ انہیں یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ میں تمہارے گھر آنا جانا رکھوں کیونکہ یہ خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ میں صرف ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے تمہارے گھر نہیں آتا۔ یونیورسٹی آجاتا ہوں لیکن تم نے اس بات کی بالکل پروا نہیں کی کہ امی کو کتنا برا لگے گا اور وہ مجھ سے کتنی ناراض ہوں گی۔"

"عارفین! میں تم سے چوری چھپے نہیں ملتی ہوں۔ سب کے سامنے ملتی ہوں اور وہ بھی اس لئے کیونکہ تم میرے شوہر ہو اگر منگیتر ہوتے تو میں کبھی نہ ملتی نہ یونیورسٹی میں نہ گھر پر۔ جو چیز غلط ہے ہی نہیں میں اسے غلط طریقے سے کیوں کروں۔ اگر اپنی امی کو سچ بتا دیتی ہوں تو تمہاری امی سے غلط بیانی کیوں کروں پھر بھی اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

"خیر، میں نے ایکسکیوز کرنے کو تو نہیں کہا بہر حال میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں۔" عارفین نے موضوع بدل دیا تھا۔

"کتنے دنوں کے لئے جا رہے ہو؟"

"ابھی تو ایک ہفتہ کے لئے جا رہا ہوں لیکن ہو سکتا ہے چند دن اور لگ جائیں۔ تم یہ بتاؤ تمہارے لئے کیا لاؤں؟" عارفین نے اس سے پوچھا تھا۔

"عارفین! تم جانتے ہو، میں چیزوں کی فرمائش نہیں کیا کرتی۔" صبا نے بڑی رسانیت سے جواب دیا تھا۔

"پھر بھی یار! کچھ تو فرمائش کیا کرو۔ مجھے اچھا لگے گا۔" "پہلے بھی اپنی مرضی سے گفٹ لاتے ہو، اب بھی جو دل چاہے لے آنا۔"

صبا! میرا دل چاہتا ہے، کبھی تم مجھ سے کوئی فرمائش کرو۔ پھر دیکھو، میں اسے کیسے پورا کرتا ہوں۔"

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "چلو کبھی مانگوں گی تم سے کچھ۔ دیکھوں گی میری فرمائش پوری کرتے ہو یا نہیں۔"

"Any Time" عارفین نے خوش دلی سے سر ہلایا تھا۔

"ایک بات کہوں عارفین؟" صبا یکدم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ہاں ضرور۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟"

"یہ جو انسان ہوتا ہے بعض دفعہ یہ بنا مانگے تو کچھ بھی دے دیتا ہے لیکن مانگنے پر کچھ بھی نہیں دیتا۔"

"تمہارا اشارہ میری طرف ہے؟" وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

"صبا! پتا نہیں بعض دفعہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

"عارفین! کیا انسان اعتبار کے قابل ہے؟"

"صبا! میں اپنی بات کر رہا ہوں۔"

وہ اس کی بات پر کچھ جھنجھلا گیا تھا۔

"عارفین! یہ ضروری نہیں ہے جس سے محبت کی جائے، اس پر اعتبار بھی کیا جائے جیسے یہ ضروری نہیں کہ جس پر اعتبار کیا جائے اس سے محبت بھی کی جائے۔"

وہ اس کی بات کے جواب میں خاموش بیٹھا رہا۔

"ناراض ہو گئے ہو؟" صبا نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں۔ ناراض کس بات پر ہونا ہے۔ تم نے کوئی اتنی قابل اعتراض بات تو نہیں کہی۔"

"پھر بھی تمہیں برا لگا ہے نا؟" صبا اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش میں تھی۔

"ہاں۔ برا لگا ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ خیر تم پریشان مت ہو۔ میرا خیال ہے، اب مجھے چلنا چاہئے۔" عارفین نے گھڑی دیکھی تھی۔

"لیکن جانے سے پہلے ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ مجھے تمہاری بہت پروا ہے، کل بھی تھی اور ہمیشہ رہے گی۔"

وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

❁

وہ اس دن صبح سے ہی پریشان تھی۔ "اگر امی اپنی مرضی سے شادی نہ کرتیں تو آج میں امی کے رشتہ داروں کا سامنا کرنے سے اس قدر پریشان نہ ہوتی۔"

وہ بار بار بے دلی سے سوچ رہی تھی۔ قرآن خوانی سہ پہر کے وقت تھی اور چونکہ چھٹی کا دن تھا۔ اس لئے حیدر بھی گھر ہی تھا۔ مردوں کے بیٹھنے کا انتظام لان میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔ سارہ کو ملازموں کو کوئی ہدایت نہیں دینی پڑ رہی تھی۔ وہ کسی مشین کی طرح خود ہی ہر کام نبٹا رہے تھے۔ لوگوں کے آنے کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہو گیا تھا۔ عارفین آنے والوں کا اس سے تعارف کروا رہے تھے۔ ہر ایک رسمی سے کلمات دہراتا اور ہال میں بیٹھ جاتا۔

"سارہ! یہ میری سب سے بڑی بہن ہیں۔"

عارفین ایک عورت کے ساتھ اس کے پاس آئے تھے۔ وہ عورت یکدم سارہ سے لپٹ گئی اور اس نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"صبا نے ضد پوری کر لی۔ کتنا سمجھایا تھا۔ کتنا کہا تھا اسے مگر اس نے بات نہیں مانی، واپس نہیں آئی۔ ارے غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے پھر وہ تو......"

وہ روتے ہوئے اونچی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ عارفین نے بروقت مداخلت کی تھی۔

"آپا! پچھلی باتوں کو چھوڑیں۔ ماضی کو رہنے دیں۔"

"کیسے رہنے دوں عارفین! کیسے رہنے دوں۔ مجھے صبر نہیں آتا۔ مجھے سکون نہیں ملتا۔ کوئی ایسے کرتا ہے جیسے صبا نے کیا۔ یہ کوئی اس کے مرنے کی عمر تھی۔ مگر اس پر تو ایک ہی ضد......"

"آپا پچھلی باتیں نہ دہرائیں۔ بس کریں جو ہو گیا۔ اسے بھول جائیں۔ اس کے لئے دعا کریں۔"

عارفین نے زبردستی انہیں سارہ سے الگ کیا تھا۔ عارفین انہیں لے کر ہال سے باہر چلے گئے۔ وہ بوجھل دل سے وہیں دوسری عورتوں کے پاس بیٹھ گئی۔

"اور اب وہ آپا کو سمجھائیں گے کہ وہ میرے سامنے میری ماں کے ماضی کے بارے میں کوئی بات نہ کریں کیونکہ اس سے مجھے تکلیف ہو گی۔ کاش یہ بات ایک بار امی نے بھی سوچ لی ہوتی کہ اس طرح کے رشتے اولاد کے لئے کتنا بڑا عذاب بن جاتے ہیں۔"

آیت کریمہ کا ورد کرتے ہوئے وہ سر جھکائے بھیگی پلکوں کے ساتھ مسلسل امی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عارفین کی دوسری دونوں بہنیں بھی آ گئی تھیں مگر بڑی بہن کی نسبت وہ سارہ سے بہت محتاط اور نارمل انداز میں ملی تھیں۔ ان کے آنے کے چند منٹ بعد عارفین کی بڑی بہن دوبارہ ہال میں آ گئی تھیں۔ وہ اب بھی نڈھال نظر آ رہی

تھیں۔ مگر پہلے کی طرح رو نہیں رہی تھیں۔ وہ آکر سارہ کے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

آیت کریمہ کا ورد کرنے اور قرآن خوانی کے بعد دعا کروانے والی عورت نے دعا کرنی شروع کر دی تھی۔ وہ مختلف آیات کو ترجمے کے ساتھ پڑھتی جا رہی تھی۔

"اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی۔ وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

دعا کرانے والی عورت نے ایک آیت کا ترجمہ کیا تھا۔ آپا ایک بار پھر بلک بلک کر رونے لگی تھیں۔ سارہ کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ اس کا سر دوبارہ کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ ضبط کرنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

"اللہ تم ای کو بخش دینا۔" "تم ان کو معاف کر دینا جیسے ان سب لوگوں نے کیا ہے۔"

بے اختیار اس کے دل سے دعا نکلی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سب لوگ جانے لگے تھے ایک بار پھر وہی تعزیتی کلمات سنتی لوگوں کو جاتا دیکھتی رہی۔ آپا بھی اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے کر چلی گئی تھیں۔ ملازموں نے چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں۔ باہر عارفین عباس اور حیدر لوگوں کو رخصت کر رہے تھے۔ لوگوں کے جانے کے بعد دونوں اندر آگئے۔

"سارہ! تم اگر آرام کرنا چاہتی ہو تو آرام کر سکتی ہو۔"

اس کی متورم آنکھیں دیکھ کر عارفین عباس نے اس سے کہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس رات وہ سو نہیں پائی۔ امی کا چہرہ بار بار اس کی نظروں کے سامنے آجاتا پھر اسے ان کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد آجاتا۔

وہ بے حد بے چین تھی۔ ایک بجے کے قریب وہ لان کی طرف کھلنے والا دروازہ

کھول کر لان میں نکل آئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیرونی دیوار پر لگائی ہوئی فلڈ لائٹس نے لان کی تاریکی کو ختم کر دیا تھا۔ ٹھنڈک ہونے کے باوجود اسے باہر آکر سکون ملا تھا۔ گھاس اوس سے بھری ہوئی تھی۔ پاؤں میں چپل کے باوجود گھاس پر چلنے کی وجہ سے اس کے پاؤں اوس سے گیلے ہو رہے تھے مگر اس کو ان کی پروا نہیں تھی۔ وہ چادر کو اپنے گرد لپیٹے بلا مقصد لان کے طول و عرض کو ناپتی رہی۔

حیدر نے دو بجے اپنا کام ختم کیا تھا۔ لائٹ آف کرنے سے پہلے وہ کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے کے لئے کھڑکی کی طرف آیا تھا۔ مگر نیچے لان میں نظر ڈالتے ہی اس کے ہاتھ پردہ کھینچتے ہوئے رک گئے تھے۔ لان میں کوئی چکر لگا رہا تھا۔ اس نے غور سے نیچے دیکھا تھا اور دوسری نظر ڈالتے ہی جان گیا تھا کہ چکر لگانے والا کون ہے۔ ناگواری کی ایک لہر سی اس کے اندر اٹھی تھی۔ وہ خود بھی نیچے آیا تھا اور پورچ کا دروازہ کھول کر باہر لان میں آگیا تھا۔

"دیکھیں، اس وقت رات کے دو بجے ہیں اور آپ اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر یہاں لان میں پھر رہی ہیں۔ کوئی بھی جو اس لان میں کسی غلط نیت سے چھپا ہو۔ وہ آرام سے آپ کی بے خبری میں آپ کے کمرے اور پھر وہاں سے گھر میں کہیں بھی جا سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا آپ کو یہ گھر، اس میں رہنے والے کتنے عزیز ہیں لیکن میرے پاپا نے اس گھر کی ہر چیز بڑی محنت سے بنائی ہے۔ اس لئے مجھے اس گھر کی سیکورٹی کی پروا ہے۔ گھر کے گیٹ پر کھڑا چوکیدار باہر کی حفاظت کر سکتا ہے۔ اندر آکر کسی کو نہیں بچا سکتا۔ اس لئے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو لان میں پھرنے کا شوق دن کے وقت پورا کیا کریں۔"

سارہ اپنے قریب ابھرنے والی اس کی آواز پر چونکی تھی اور پھر ہونق بنی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کی بات کے خاتمہ پر کچھ شرمندگی کے عالم میں وہ اپنے کمرے کی

طرف چلی گئی تھی۔ حیدر وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ جب اس نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا تو وہ خود بھی اندر چلا گیا۔

❁

اگلے دن صبح وہ ناشتہ کی میز پر موجود نہیں تھی۔ عارفین نے ملازم کو اسے جگانے سے منع کر دیا۔ عارفین اور حیدر سے اس کا سامنا رات کے کھانے پر ہوا تھا۔

"عارفین انکل! کیا آپ میرے نانا سے میرا رابطہ کروا سکتے ہیں؟"

حیدر چائے پیتے پیتے رک گیا اور عارفین عباس نے بے حد حیرانی سے اسے دیکھا۔

"تم ان سے رابطہ کیوں چاہتی ہو؟" عارفین نے کچھ بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

"میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں اگر وہ مان گئے تو۔" وہ اب میز کی سطح کو گھورنے لگی تھی۔

"ان کے پاس جانا چاہتی ہو؟ کیا تم یہاں خوش نہیں ہو۔" عارفین نے کچھ بے یقینی سے کہا تھا۔

وہ چپ رہی تھی۔

"سارہ! تمہاری امی چاہتی تھیں کہ تم میرے پاس رہو اور میں تمہیں ان کے گھر والوں کے پاس نہ بھیجوں۔"

"وہ ایسا کیوں چاہتی تھیں؟" اس نے یک دم سر اٹھا کر سوال کیا تھا۔ عارفین کوئی جواب نہیں دے سکے۔ حیدر خاموشی سے چائے کے سپ لیتا ہوا دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔

"یہ صبا ہی بہتر جانتی ہو گی۔" بہر حال ان کے پاس جانے کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

کچھ دیر بعد انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

"پاپا! اگر یہ اپنے نانا کے پاس جانا چاہتی ہیں تو آپ انہیں جانے دیں۔ یہ واقعی ان کے حق میں بہتر ہو گا۔" یکدم حیدر نے فرنچ میں اپنے باپ سے کہا تھا۔

"تم اسے کیوں بھیجنا چاہتے ہو؟" عارفین نے بڑے تیکھے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"نہیں۔ میں کیوں بھیجنا چاہوں گا۔ میں تو ویسے ہی آپ کو اپنی رائے دے رہا تھا۔ پاپا! میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ یہ اپنے نانا اور ماموں کے پاس زیادہ محفوظ رہے گی، کیونکہ یہاں یہ ساری عمر تو نہیں رہ سکتیں اور پھر ہم انہیں کتنی دیر رکھیں گے۔" وہ دھیمے لہجے میں سنجیدگی سے کہتا گیا تھا۔

"حیدر! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ اسے کب تک یہاں رہنا ہے۔ اس کا دارومدار اس پر ہے۔ چاہے وہ ساری عمر رہے۔ تمہیں اس کے بارے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

عارفین عباس نے بے حد خشک لہجے میں اس سے کہا تھا۔ حیدر دوبارہ بولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ وہ بے حد خاموشی سے ناشتہ کرتے ان کی باتیں سنتی رہی۔ اسے پہلے ہی دن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ حیدر کو اس کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا اور اس وقت اس کی باتوں نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ بار بار اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اس طرح بوجھ بن کر رہنا اس کے لئے یکدم دشوار ہو گیا تھا۔

"کسی کو بھی خواہ مخواہ کی ذمہ داری اور خرچ اچھا نہیں لگتا۔ حیدر نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ مجھے کتنی دیر یہاں رکھ سکتے ہیں اور حیدر میرے بارے میں عزت سے کیسے سوچ سکتا ہے، جب وہ جانتا ہے کہ اس کا باپ کسی زمانے میں میری ماں کو پسند کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے اور اب اس عورت کی بیٹی ایک بوجھ بن کر ان کے گھر آ گئی ہے۔"

وہ دل ہی دل میں حیدر کو حق بجانب سمجھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔

"اگر میں اپنے نانا کے پاس نہیں جا سکتی تو پھر مجھے کسی نہ کسی طرح اس گھر سے بھی چلے جانا چاہئے۔ میں واقعی یہاں بہت زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی۔"

اس نے ناشتہ کرتے ہوئے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا۔

✽

سرمد کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی، رات گئے تک ایک طوفان بدتمیزی برپا رہتا۔ اسے ایسی محفلوں سے شروع سے ہی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اگر وہ ان کے پاس جا کر بیٹھتی بھی تو بہت مختصر وقت کے لئے۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ رات کے وقت جب ڈھولک بجنا شروع ہوتی تو ان کے گھر تک آواز آتی۔ وہ پڑھتے پڑھتے بعض دفعہ جھنجلا جاتی لیکن وہ کسی کو روک نہیں سکتی تھی۔ نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔

شادی سے تین چار دن پہلے اس کے چھوٹے تایا کی بیٹیاں زبردستی اسے اپنے حصے میں لے آئی تھیں وہ ان کے اصرار کے وجہ سے انکار نہیں کر سکی پھر اب شادی میں چند دن رہ گئے تھے اور یہ سارا ہنگامہ ختم ہو ہی جانا تھا، باقی کزنز کے ساتھ بیٹھی وہ بھی تالیاں بجاتی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد واپس آ جاتی۔

اس رات بھی وہ ابھی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ عارفین کی امی آ گئی۔

"صبا! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔ اصل میں تمہارے تایا ابو نے کہا ہے کہ اوپر عارفین کے کمرے میں کچھ بستر لگا دوں کیونکہ کچھ دیر میں کچھ اور لوگ آنے والے ہیں۔ عورتوں کے رہنے کا انتظام تو خالہ نے اپنے ہاں کر لیا ہے مگر مردوں کے لئے ان کے ہاں جگہ نہیں رہی۔ اس لئے تمہارے تایا نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے کو کہہ دیا

ہے۔ نیچے تو تمہیں پتا ہے پہلے ہی جگہ نہیں ہے، ویسے بھی کل نجمہ اور سلمیٰ بھی سرمد کی شادی میں شرکت کے لئے اپنے بچوں کے ساتھ آ جائیں گی۔ اس لئے میں نے سوچا، عارفین کے کمرے میں بستر لگا دوں۔ وہ تو ابھی اسلام آباد سے آیا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تائی امی! میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

اس نے کچھ خوشگوار حیرت سے اٹھتے ہوئے کہا تھا، پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تائی نے اتنی اپنائیت سے اس سے بات کی تھی۔ ورنہ وہ تو ہمیشہ لعن طعن ہی کرتی رہتی تھیں۔ تائی اسے اپنے حصہ میں لے آئی تھیں۔ اسٹور میں جا کر جب تائی بستر نکالنے لگیں تو انہیں اچانک کوئی خیال آیا تھا۔

"صبا! مجھے تو یاد ہی نہیں رہا میں نے آسیہ سے کہا تھا کہ عارفین کے کمرے میں بستر لگا دو۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اس نے بستر لگا دیے ہیں کیونکہ یہاں بستر کم ہیں۔ تم ایسا کرو، ذرا عارفین کے کمرے میں جا کر دیکھ آؤ کہ وہاں بستر لگے ہیں یا نہیں، خواہ مخواہ بستر اٹھا کر اوپر جاتی آتی رہو گی۔"

"ٹھیک ہے تائی امی! میں دیکھ آتی ہوں۔" اس نے تابعداری سے کہا تھا اور اوپر چلی آئی۔ عارفین کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر لائٹ بند تھی لیکن ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹک کر رک گئی۔

"اندر کون ہے؟" اس نے وہیں سے آواز لگائی تھی۔

"صبا! میں ہوں اندر۔ عارفین کے کمرے کے بلب ہولڈر میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ میں وہ ٹھیک کر رہا ہوں۔ تائی امی نے کہا تھا مجھ سے۔" اس نے اپنے تایا زاد عادل کی آواز پہچان لی۔ ایک اطمینان بھری سانس لے کر وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ وہ ایک ہاتھ میں لالٹین پکڑے دوسرے ہاتھ سے بلب لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں دیکھنے آئی تھی کہ یہاں کوئی بستر تو نہیں لگے مگر یہاں پر تو کوئی بستر نہیں

ہیں۔" اس نے نیم روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا تھا۔

"اچھا اب اگر آہی گئی ہو تو یہ ذرا لالٹین ——" عادل کے الفاظ منہ میں رہ گئے تھے۔ کسی نے باہر سے دروازہ کھینچ کر بند کر دیا تھا۔ عادل یکدم کود کر اسٹول سے نیچے اترا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" وہ حواس باختہ سا دروازے کی طرف گیا تھا۔ اس نے دروازہ پکڑ کر کھینچا تھا مگر دروازہ ہلا تک نہیں۔

"صبا! کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔" اس نے پریشانی کے عالم میں اس سے کہا تھا۔

"میں دروازہ بجاتی ہوں۔ تائی امی نیچے ہی ہیں۔ وہ کھول دیں گی۔"

صبا، عادل کے برعکس بالکل نہیں گھبرائی تھی۔ اس نے دروازے کو زور زور سے بجانا شروع کر دیا۔ مگر ایک دو منٹ گزرنے کے بعد بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ عادل کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہولڈر میں بلب لگانا بھول چکا تھا۔

چند منٹ مزید دروازہ بجانے کے باوجود جب کوئی اوپر نہیں آیا تو یکدم وہ بھی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ دونوں کو اس نازک صورت حال کا احساس تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔ پھر یکدم ہی نیچے سے شور کی آواز آنے لگی تھی۔ صبا دروازہ بجاتے بجاتے رک گئی۔

شور کچھ عجیب سا تھا یوں جیسے کوئی بین کر رہا تھا۔ صبا نے کچھ خوفزدہ ہو کر عادل کو دیکھا تھا۔ لالٹین کی ہلکی روشنی بھی اس کے چہرے کی زردی کو نمایاں ہونے سے نہیں بچا سکی۔ آوازیں اب اوپر کی طرف آ رہی تھیں۔ صبا نے تائی امی کی آواز پہچان لی۔ وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ساتھ کچھ کہتی جا رہی تھیں۔ پھر کچھ لوگ تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ دونوں دم سادھے زرد رنگت کے ساتھ دروازہ بجانے کے بجائے ایک دوسرے کے چہرے دیکھتے رہے۔ تائی امی جو کہہ رہی تھیں۔ وہ دونوں

نے سن لیا تھا۔ وہ جانتے تھے، اب اگر وہ دروازہ نہ بھی بجائیں تو بھی دروازہ کھل جائے گا۔

ہر روز وہ اخبار لے کر بیٹھ جاتی اور ایک ایک اشتہار پڑھ ڈالتی۔ ہر وہ ملازمت جو اسے ذرا بھی مناسب لگتی وہ وہاں اپلائی کر ڈالتی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ گریجویشن کی عملی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ہر جگہ کم از کم ماسٹرز والے بندے کی ضرورت ہوتی تھی اور اگر کسی جگہ گریجویشن مطلوبہ کوالیفیکیشن ہوتی تو ساتھ فریش گریجویٹ بھی لکھا ہوتا اور سارہ کو گریجویشن کئے چار سال ہو چکے تھے۔ اب اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ کسی جاب کے لئے صرف گارنٹی نہ ہونے کی وجہ سے اپلائی نہ کرنے کے مسئلے سے دوچار نہیں تھی۔

اس نے ابھی عارفین عباس کو جاب کی تلاش کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جاب ملنے کے بعد وہ انہیں بتا دے گی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر اس نے پہلے انہیں اپنی جاب کے بارے میں بتایا تو وہ شاید اسے جاب ڈھونڈنے کی اجازت نہ دیں۔ آہستہ آہستہ اسے انٹرویو کالز ملنے لگیں اور اس نے گھر سے باہر جانا شروع کر دیا۔ عارفین عباس کو ابھی بھی اس نے نہیں بتایا تھا کہ وہ انٹرویوز کے لئے مختلف جگہوں پر جا رہی ہے، بعض دفعہ وہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں فون کرتے تو ملازم ان سے کہہ دیتا کہ سارہ اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہے۔ سارہ ملازم سے یہی کہہ کر جاتی تھی اور پھر جب وہ سارہ سے پوچھتے تو وہ انہیں مطمئن کر دیتی۔

عارفین عباس کو بھی یہ سوچ کر تسلی ہو جاتی کہ وہ رفتہ رفتہ نارمل زندگی کی طرف آ رہی ہے اور اپنے لئے مصروفیت ڈھونڈ رہی ہے۔ سارہ کو گھر سے باہر نکل کر پہلی دفعہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ شہر کتنا بڑا ہے اور جاب کا حصول کتنا مشکل ہے۔ اس سے پہلے اسے امی کی وجہ سے بڑی آسانی سے ایک فیکٹری میں جاب مل گئی تھی اور چند اور جگہ

جب اپلائی کرنے پر اسے جاب نہیں ملی تھی تو اس نے زیادہ تردد نہیں کیا تھا اور فیکٹری کی جاب کو ہی غنیمت سمجھ لیا تھا مگر اس بار وہ ایک بہتر جاب کی تلاش میں تھی جو اس کے اخراجات پورا کر سکتی۔

سارا دن پیدل دفتروں کے چکر کاٹتے کاٹتے وہ آہستہ آہستہ دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے پوری دنیا میں اس کے لئے ایک بھی جاب نہیں تھی۔

اس روز رات کے کھانے پر حسب معمول حیدر اور عارفین فرنچ میں باتیں کر رہے تھے اور وہ بڑی بے دلی سے کھانا کھاتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ خلاف معمول حیدر ڈریسنگ جیفار ہا تھا سب سے پہلے ٹیبل سے عارفین عباس اٹھ کر گئے تھے۔ سارہ بھی کھانا کھا چکی تھی اور عارفین عباس کے اٹھنے کے چند منٹ بعد جب اس نے اٹھنا چاہا تو حیدر نے اسے روک دیا۔

"ایک منٹ سارہ! آپ بیٹھیں۔ مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

حیدر نے سویٹ ڈش کھاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کچھ حیران سی دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"آج میں نے آپ کو فیکٹری ایریا میں دیکھا تھا۔ پوچھ سکتا ہوں آپ وہاں کس لئے گئی تھیں؟" پانی کا گلاس ہاتھ میں لئے اس پر نظریں جمائے اس نے پوچھا تھا۔ سارہ کے لئے اس کا سوال خلاف توقع تھا۔ وہ چند لمحے چپ رہی اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

میں فیکٹری ایریا نہیں گئی۔" اس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بولا۔

حیدر اسے حیرانی سے دیکھ کر رہ گیا، شاید اسے سارہ سے اس سفید جھوٹ کی توقع نہیں تھی۔ "لیکن آپ آج گھر پر نہیں تھیں۔ میں نے ملازم سے پوچھ لیا ہے۔"

"ہاں میں گھر پر نہیں تھی۔ میں اپنی ایک دوست کے پاس گئی ہوئی تھی لیکن میں فیکٹری ایریا نہیں گئی۔"

سارہ کو خود حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنے اطمینان سے جھوٹ بول رہی ہے۔

"ہو سکتا ہے، مجھے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو بہر حال آئی ایم سوری۔"

حیدر نے جس طرح یہ جملہ ادا کیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے سارہ کی بات پر یقین نہیں آیا اور وہ صرف مروتاً ایکسکیوز کر گیا تھا۔

سارہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے حیدر کی یہ تفتیش اچھی نہیں لگی تھی اور نہ ہی وہ اس سے پریشان ہوئی تھی۔ ہاں چند دن احتیاطاً باہر نہیں گئی۔ گھر پر ہی رہی لیکن چند دن گزر جانے کے بعد ایک بار پھر اس نے جاب کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی۔

اس دن بھی دو جگہ انٹرویو دینے کے بعد تیسری جگہ جانے کے لئے وہ بس اسٹاپ پر کھڑی تھی جب اچانک ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی۔

"آئیں۔ آپ کو جہاں جانا ہے۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔" ایک مانوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔"

"یا اللہ! کیا ضروری تھا کہ اس سے میرا سامنا اس آخری انٹرویو سے پہلے ہوتا۔" سارہ نے بے اختیار دل میں کہا تھا۔ بجھے دل سے وہ گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"سارہ! میں آپ کا ڈرائیور نہیں ہوں۔ آپ آگے آ کر بیٹھیں۔" اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔ وہ کوئی اعتراض کئے بغیر آگے بیٹھ گئی تھی۔

"کہاں جانا ہے آپ کو؟" حیدر نے گاڑی بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔" اس نے جھوٹ بولا تھا۔ حیدر نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"اگر کہیں اور جانا ہے تو میں وہاں بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"نہیں مجھے گھر ہی جانا ہے۔"

چند لمحے گاڑی میں خاموشی رہی۔

"آپ سارا سارا دن کہاں پھرتی رہتی ہیں؟ روزانہ کسی دوست کے گھر تو نہیں جایا جاسکتا۔"

حیدر نے اسے دیکھے بغیر اس سے پوچھا تھا سارہ نے یک دم سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں جاب کی تلاش کر رہی ہوں؟"

اسے لگا، حیدر پہلے ہی اسی جواب کی توقع کر رہا تھا۔ "اور اسی لئے اس دن فیکٹری ایریا میں گئی......"

سارہ نے اس کی بات کاٹنا ضروری سمجھا۔

"نہیں۔ میں اس دن وہاں نہیں گئی تھی۔"

"سارہ! آپ وہاں گئی تھیں۔ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے آپ کو جس فیکٹری سے نکلتے دیکھا تھا آپ کے انکار کے بعد وہاں فون کر کے آپ کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ اگر اس دن میرے ساتھ میرا دوست نہ ہوتا تو میں گاڑی روک کر آپ کو پک کر لیتا پھر کم از کم آپ اسے میری غلط فہمی قرار نہ دیتیں۔"

سارہ کو اس کا لہجہ قدرے تلخ لگا۔ وہ کچھ بول نہیں پائی۔

"کوالیفکیشن کیا ہے آپ کی؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تھا۔

"گریجویشن"

"سبجیکٹس کون سے تھے آپ کے؟"

"اکنامکس اور...... اردو۔" فرنچ کہتے کہتے رک گئی اور پھر اس نے فرنچ کے بجائے اردو کہہ دیا۔

"پاپا کو پتا ہے کہ آپ جاب ڈھونڈ رہی ہیں؟" اس نے کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد ایک بار پھر پوچھا تھا۔

"میں انہیں بعد میں بتا دوں گی۔"

اس بار حیدر نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا۔ سارہ کو اس کے چہرے پر کچھ خفگی نظر آئی۔

"دیکھیں سارہ! آپ ہمارے گھر رہتی ہیں اور ہماری ذمہ داری ہیں۔ جو آپ کر رہی ہیں اور جو آپ کرنا چاہتی ہیں۔ پاپا کو اس کے بارے میں پتا ہونا چاہئے۔ بعد میں اگر کوئی پرابلم ہوا تو سارا الزام پاپا پر آئے گا کیونکہ آفٹر آل انہوں نے ہی آپ کو گھر میں رکھا ہے۔ مجھے دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن آئندہ آپ جاب کے لئے گھر سے باہر جائیں تو پاپا کو اس بات کا پتا ہونا چاہئے اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں پاپا کو بتا دوں گا۔ مجھے امید ہے آپ میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کریں گی۔"

وہ جتنی اچھی فرنچ بولتا تھا۔ اس سے زیادہ شستہ اردو میں بات کرتا تھا مگر اس وقت تو سارہ کو زہر لگ رہا تھا۔ وہ اسے گیٹ پر اتار کر چلا گیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر چلی آئی۔

❁

دروازہ کھل گیا تھا۔ باہر کھڑے مجمع کو جیسے توقعات کے مطابق ان دونوں کو اندر سے نکلتے دیکھ کر بھی حیرت ہوئی تھی۔

"تائی امی! کسی نے باہر سے......" صبا نے آخری بار صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے کیا تھا دروازہ بند تاکہ تم دونوں کے کرتوت سب کو دکھا سکوں۔" تائی امی شیر کی طرح اس پر جھپٹی تھیں۔

"آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ ہی نے تو مجھے یہاں بستر دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔" صبا نے یکدم چلا کر کہا تھا۔

"آوارہ، چڑیل! حرافہ! میں نے تمہیں یہاں بستر دیکھنے کے لئے بھیجا تھا۔ میرا دماغ خراب تھا۔ میں یہاں عارفین کے کمرے میں کس کے لئے بستر لگواؤں گی۔ بے غیرت! بے حیا! تمہیں شرم نہیں آئی میرے بیٹے کے کمرے میں منہ کالا کرتے ہوئے۔ ہائے میرا عارفین۔ اسے کیا پتا تھا وہ کس بے حیا کو بیاہنے کی بات کر رہا ہے۔"

تائی امی نے دہائی دیتے ہوئے اپنا سینہ پیٹ لیا تھا۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں تائی امی! آپ تہمت لگا رہی ہیں۔" صبا نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ کہا تھا۔

"ہوش کریں تائی امی! خدا کے لئے ہوش کریں۔ ایسی بات نہ کریں۔ آپ نے تو مجھے بلب ہولڈر ٹھیک کرنے بھیجا تھا۔" عادل نے بھرائی ہوئی آواز میں تائی امی کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"میں ہوش کروں؟ میں ہوش کروں؟ تم لوگوں کے کرتوت لوگوں کو نہ بتاؤں۔ تم لوگوں کے کارناموں پر پردہ ڈال دوں۔ عارفین تمہیں بھائی کی طرح سمجھتا تھا۔ تم نے بھائی کی پشت میں خنجر گھونپ دیا ہے یا اللہ میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔"

تائی امی نے ہاتھ ملتے اور بلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ صبا نے ایک نظر اپنی امی کی طرف دیکھا جو گم صم ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس کی چھوٹی بہن رو رہی تھی۔

"تائی امی! میں نے کچھ نہیں کیا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں عارفین کی بیوی ہوں۔ میں اسے دھوکا کیسے ــــــ"

تائی امی نے اس کے چہرے پر تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ "نام مت لے بے غیرت! عارفین کا نام مت لے۔ تو عارفین کے لئے مر گئی ہے۔ کیا تیرے جیسی بدکردار کو اس گھر میں لائیں گے۔ ارے جاؤ جا کر گھر کے مردوں کو بلا کر لاؤ۔ ان سے کہو دیکھیں اس گھر پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔" تائی امی نے ہاتھ لہرانے شروع کر دیے تھے۔

"خدا کا خوف کریں تائی امی! خدا کا خوف کریں۔" عادل ایک بار پھر ان کے سامنے گڑگڑایا تھا۔

"تم لوگوں کو خدا کا خوف کیوں نہیں آیا؟ میں تو تم دونوں کے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈلواؤں گی۔ بخشوں گی تو نہیں۔" انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ عادل کے دل میں پتا نہیں کیا آئی تھی۔

"تم ایک ذلیل عورت ہو۔ تم نے جان بوجھ کر ہم دونوں کو پھنسایا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے ہاتھوں مرنے کے لئے یہاں بیٹھا رہوں گا، لیکن تم یاد رکھنا۔ میں جب بھی واپس آؤں گا۔ تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

عادل یک دم ادب آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے تائی پر دھاڑا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا، وہ بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا تھا۔ تائی امی نے اس کے بھاگنے پر کوئی شور و غوغا بلند نہیں کیا۔

"اگر یہ بے گناہ ہوتا تو یہاں سے بھاگتا کیوں؟ دیکھ لو عالیہ دیکھ لو اپنی بیٹی کے کرتوت۔ تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ اسے روکو۔ تم نے ایک نہیں سنی تھی۔ اب ساری عمر اپنا منہ چھپاتی پھرنا۔"

تائی امی نے صبا کی امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا جو اب ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ صبا نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ ہجوم اس کے ارد گرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ وہ عادل کی طرح وہاں سے بھاگ نہیں سکتی تھی، وہ بھاگنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ہاں اگر کچھ سمجھ میں آ رہا تھا تو وہ سامنے کھڑے لوگوں کی نظریں تھیں جو نیزے کی انی کی طرح اس کے جسم کو چھید رہی تھیں۔ وہ اب انتظار میں تھی کہ تایا اور دوسرے لوگ اوپر آئیں اور وہ انہیں اپنی بات سمجھائے۔ اسے توقع تھی کہ وہ اس کی بات سمجھ لیں گے اور توقع ہمیشہ صرف توقع ہی رہتی ہے۔

عارفین کی بڑی بہن نے نیچے جا کر اپنے باپ کو سب کچھ اسی طرح بتا دیا تھا جس طرح تائی امی کہہ رہی تھیں۔ وہ آگ بگولا ہو کر اوپر آئے تھے۔ تائی نے انہیں دیکھتے ہی اپنے بین اور دہائیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ صبا کو دیکھتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گئے تھے۔ انہوں نے صبا کی بات نہیں سنی۔ کوئی بھی اب اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ گونگی ہو گئی ہے یا باقی سب بہرے ہو چکے تھے۔ مغلظات کا ایک طوفان تھا جو تایا کے منہ سے ابل پڑا تھا۔

"میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے گولی مار دوں گا تاکہ آئندہ ایسی حرکت کرنے کی کسی میں جرأت نہ ہو سکے۔"

انہوں نے یک دم فیصلہ کیا تھا اور لپکتے ہوئے نیچے چلے گئے تائی کو اچانک صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

"بے غیرت! جاؤ اب اپنے گھر اور کیا تماشا کروانا چاہتی ہو یہاں؟ چاہتی ہو کہ میرا باپ تمہیں مار کر خود پھانسی چڑھ جائے۔ ہمارا گھر تباہ ہو جائے۔ نکلو یہاں سے، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

یکدم عارفین کی سب سے بڑی بہن اس کی طرف آئی تھیں اور اس کا بازو کھینچ کر انہوں نے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ اس کا دوپٹہ نیچے گر پڑا۔ آپا نے اسے دوپٹہ اٹھانے کی مہلت نہیں دی۔ وہ ہونٹ کاٹتے آنسوؤں کو ضبط کرتے دوپٹے کے بغیر ہی نیچے اترنے لگی۔

نیچے ہنگامہ برپا تھا۔ تایا ابا اپنا پستول نکال رہے تھے اور تائی اور ان کے دونوں چھوٹے بھائی انہیں پکڑ رہے تھے۔ سرمد کے ابو نے ان سے پستول چھین لیا تھا۔ صبا اندھوں کی طرح چلتی ہوئی باہر صحن میں نکل آئی تھی۔

"میرے لئے تم مر گئی ہو۔ میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں دل

چاہے چلی جاؤ لیکن اپنے گندے قدم میرے گھر میں مت لانا۔"

صحن میں نکلتے ہی اس نے پیچھے اپنی ماں کی آواز سنی تھی۔ انہوں نے اقصیٰ کا ہاتھ پکڑا تھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے حصے کی طرف چلی گئی تھیں۔ وہ وہیں ساکت ہو گئی۔ کوئی چیز اس کے چہرے کو بھگونے لگی تھی۔

اس کے حصے کے علاوہ باقی ہر حصے کے برآمدوں میں لوگ جمع تھے۔ کچھ کو وہ جانتی تھی کچھ کو نہیں جانتی تھی مگر آج کے بعد ساری عمر اس کا چہرہ انہیں یاد رہنا تھا۔ یک دم اسے کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ وہ فرش پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔ خطرے کے سامنے آنکھیں موند لینا کبوتر کو کیوں اس قدر پسند ہے۔ اسے آج پتا چلا تو۔ پھر اچانک اسے تایا کی دھاڑ سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر تایا کے گھر کی طرف دیکھا۔ وہ صحن میں نکل آئے تھے اور اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں ان سے کہوں گی۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں انہیں بتاؤں گی۔" اس نے سوچا تھا۔ وہ اب بھی اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔

"تایا ابو! میری بات سنیں۔" اس نے ان کے قریب آنے پر بلند آواز سے کہا تھا لیکن وہ بات سننے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے اس کے قریب آتے ہی دونوں ہاتھوں سے اس کے بال پکڑ لیے تھے۔

"یہ نہ کریں تایا ابو! یہ نہ کریں۔" وہ خوف سے چلائی تھی۔

برآمدے لوگوں سے بھر گئے تھے۔ بچے اشتیاق کی وجہ سے صحن میں نکل آئے تھے۔ انہوں نے بال کھینچتے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے اسے فرش پر دھکا دیا تھا۔ پھر پاؤں سے جوتا اتار لیا تھا۔ اس نے خوف کے عالم میں انہیں دیکھا تھا۔

"تایا.....!" اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی تھی۔ وہ پوری طاقت سے اس کے سر پر

جوتے برسا رہے تھے۔ صبا نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ ان کے اشتعال میں اور اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لئے تھے۔ پتا نہیں صبا کے دل میں کیا آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔

"نہیں تایا ابو! یہاں صحن میں لوگوں کے سامنے اس طرح نہ ماریں۔ مارنا چاہتے ہیں تو مجھے گولی مار دیں یا مجھے پستول دے دیں۔ میں خود اپنے آپ کو گولی مار لیتی ہوں۔"

انہوں نے اس کے سر پر جوتے مارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے آخری بار سر اٹھا کر دور برآمدوں میں کھڑے لوگوں کو دیکھا تھا پھر اس نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر چھپا لیا تھا۔

تایا ابا اس پر جوتے برسا رہے تھے۔ وہ کسی حرکت، کسی شور کے بغیر خاموشی سے پٹ رہی تھی۔ دور کہیں سے اسے اقصیٰ کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"یہ کیوں کیا آپی؟ یہ کیوں کیا؟" وہ چلا رہی تھی۔ وہ جواب دینا چاہتی تھی مگر وہ بول نہیں سکتی تھی۔

درد کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سر اٹھا کر ایک بار اقصیٰ کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ آج یوم حساب تھا۔

❁

حیدر کی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ملازمت کی تلاش اور تیز کر دی تھی لیکن جب چند اور ہفتے اسی طرح گزر گئے تو اس نے ایک اکیڈمی کے ذریعے ایک گھر میں آٹھویں کلاس کے ایک بچے کو میتھس کی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی۔ دو گھنٹے کے لئے دو ہزار روپے کی یہ جاب اس کے لئے بے حد پرکشش تھی۔ اسے شام کو دو سے چار بجے تک اس بچے کو پڑھانے کے لئے جانا ہوتا تھا اور اس نے عارفین عباس سے کہا تھا کہ وہ ایک جگہ پر کپڑوں کی کٹنگ اور سلائی کا کورس کرنا چاہتی ہے اس لئے

اسے دو گھنٹے کے لئے وہاں روز جانا ہوگا۔ عارفین عباس نے کسی اعتراض کے بغیر اسے اجازت دے دی تھی۔ اور حیدر کے استفسار پر انہوں نے اسے بھی یہی بتایا تھا حیدر کو کچھ حیرت ہوئی تھی کہ یکدم جاب کی تلاش چھوڑ کر اس نے ایسی سرگرمی میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ مگر اس نے اس پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید سارہ پر اس کی باتیں اثر کر گئی ہیں۔

اس دن چھٹی کا دن تھا اور اس کا کوئی دوست اس سے ملنے آیا تھا۔ سارہ، عارفین عباس کے پاس باہر لان میں بیٹھی تھی۔ حیدر نے اپنے دوست کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا لیکن وہ ڈرائنگ روم کی قد آدم کھڑکیوں سے باہر لان کی طرف دیکھتے ہی چونک اٹھا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" اس نے انگلی سے باہر لان کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں سارہ، عارفین عباس کے پاس بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ حیدر اس کے سوال پر کچھ حیران ہوا تھا۔

"یہ میرے پاپا کی کسی کزن کی بیٹی ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ تم جانتے ہو انہیں؟" حیدر نے اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں ایسا کچھ خاص نہیں، دراصل یہ میرے بھانجے کو پڑھاتی ہیں۔ یہاں دیکھا تو حیرانی ہوئی۔ اس لئے پوچھ لیا۔"

حیدر اس کی بات پر چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

"کب سے پڑھا رہی ہیں؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا، اصل میں دو تین دن پہلے مجھے اپنی بہن کے گھر جانے کا اتفاق ہوا وہیں میں نے ان کو دیکھا تھا لیکن مجھے یہ نہیں پتا کہ انہوں نے اسے کب سے پڑھانا شروع کیا ہے۔"

وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا۔ حیدر نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کا موڈ یکدم خراب ہو گیا تھا۔ اس کا دوست کچھ دیر بیٹھا تھا اور پھر چلا گیا تھا۔ دوست کے جانے کے

بعد وہ سیدھا باہر لان میں آ گیا تھا۔ جہاں سارہ اور عارفین ابھی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

کچھ اکھڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

"سارہ! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کو جو کام بھی کرنا ہے پاپا کو اس کے بارے میں پتا ہونا چاہئے لیکن آپ نے میری بات کی قطعاً پروا نہیں کی اور پاپا کے ساتھ غلط بیانی کر کے ٹیوشن کرنے جا رہی ہیں۔"

اس نے کسی تمہید کے بغیر براہ راست اس سے بات شروع کر دی تھی۔ عارفین عباس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اخبار سامنے پڑی میز پر رکھ دیا تھا۔ سارہ کچھ حواس باختگی کے عالم میں حیدر کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس طرح پکڑی جائے گی اور حیدر کسی لحاظ کے بغیر عارفین عباس کے سامنے اس کا پول کھول دے گا۔

"کیا بات ہے حیدر؟ کیا کیا ہے سارہ نے؟" عارفین نے کچھ حیرت سے اس سے پوچھا تھا۔

"آپ ان سے پوچھیں۔" اس نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ سارہ نے اب سر جھکا لیا۔

"کیوں سارہ! کیا ہوا ہے؟" عارفین نے اب اس سے پوچھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ اس کے خاموش رہنے پر حیدر بول اٹھا تھا۔

"یہ کوئی کورس کرنے نہیں جاتی ہیں۔ کسی جگہ پر ٹیوشن کے لئے جاتی ہیں۔"

عارفین عباس کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ چند لمحوں تک وہ کچھ بول ہی نہیں پائے۔

"سارہ! یہ کیوں کر رہی ہو۔ جو روپے میں تمہیں دیتا ہوں۔ کیا وہ کافی نہیں ہیں اور اگر وہ تمہاری ضروریات کے لئے کافی نہیں ہیں تو تم مجھ سے اور روپے لے سکتی ہو مگر اس طرح۔"

سارہ نے ان کی بات کاٹ دی۔ "انکل! مجھے آپ سے روپے لینا اچھا نہیں لگتا نہ ہی مجھے وہ روپے خرچ کرنے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔ عارفین اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے۔

"دراصل مجھے اس طرح آپ کے گھر رہنا اور آپ پر بوجھ بننا اچھا نہیں لگ رہا۔ میں یہاں رہنا بھی نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" عارفین نے بے اختیار پوچھا تو۔

"انکل! میں نہیں جانتی تھی۔ امی مجھے کہاں اور کس کے پاس بھیج رہی ہیں اور عارفین عباس ان کے کیا لگتے ہیں۔ آپ کا اور ان کا کیا رشتہ تھا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جان پائی لیکن جو تھوڑا بہت جان سکی ہوں۔ وہ میرے لئے کوئی زیادہ خوشی کا باعث نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں، آپ کو یہ جان کر دکھ ہو گا لیکن آپ دونوں کا رشتہ میرے لئے کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے اور اس حوالے سے یہاں رہنا میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ آپ پر میرا کوئی حق نہیں ہے جس کے حوالے سے میں آپ سے کچھ لے سکوں یا یہاں رہ سکوں۔ میں نے اسی لئے آپ سے کہا تھا کہ آپ میرے نانا سے میرا رابطہ کروا دیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ لیکن آپ نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اب میں جاب ڈھونڈ رہی ہوں ابھی تک جاب نہیں ملی ہے۔ اس لئے میں نے ٹیوشن کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس سے کم از کم میرے اخراجات تو پورے ہو سکتے ہیں۔ جاب ملتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

اس نے آہستہ آواز میں ان دونوں کو حیران کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

"سارہ! تم اکیلے کیسے رہو گی؟" عارفین نے کچھ بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

"انکل! بہت سی لڑکیاں اکیلی رہتی ہیں پھر میرے لئے تو یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے امی کی زندگی میں بھی میں اکیلی ہوتی تھی۔"

"سارہ! تمہیں اچھا لگے یا برا لیکن تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میں تمہیں اکیلے کہیں نہیں رہنے دوں گا۔ صبا تمہیں میری ذمہ داری بنا کر گئی ہے۔ میں تمہیں اس طرح خوار ہونے کی اجازت نہیں دوں گا۔" عارفین نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

"لیکن میں......"

عارفین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "سارہ! اس مسئلے پر میں بات نہیں کروں گا۔ میرے لئے تم میری بیٹی ہو۔ یہ گھر جتنا حیدر کا ہے۔ اتنا ہی تمہارا ہے۔ تم مجھ پر پہلے کبھی بوجھ تھیں نہ آئندہ کبھی ہو گی۔ میرے اور صبا کے رشتے کے بارے میں کچھ غلط مت سوچو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور کسی وجہ سے ہماری شادی نہیں ہو سکی لیکن ہمارے درمیان یہ واحد رشتہ نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بھی تھے اور اس حوالے سے تمہارا مجھ پر حق ہے۔"

"لیکن آپ یہ کیوں نہیں چاہتے کہ میں اپنے نانا کے پاس چلی جاؤں؟" وہ ان کی بات پر کچھ جھنجلا گئی تھی۔

"صبا یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم اس کے گھر والوں کے پاس جاؤ۔"

"وہ یہ کیوں نہیں چاہتی تھیں؟"

"میں نہیں جانتا کہ وہ یہ کیوں نہیں چاہتی تھی۔"

"میں جانتی ہوں۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی وہ سب ان سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے امی سے قطع تعلق کر لیا۔ امی کا خیال ہو گا کہ وہ اب تک ان سے ناراض ہیں اور شاید وہ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب امی کے مر جانے کے بعد ان کی ناراضگی ختم ہو چکی ہو گی۔ اب وہ مجھے ٹھکرائیں گے نہیں۔ کم از کم میں ان سے بات کر کے ان کی ناراضگی دور کر سکتی ہوں۔"

عارفین اس کی باتوں پر حیران ہو گئے تھے۔ "سارہ! تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

انہوں نے پوچھا تھا۔

"کسی نے نہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میں بڑی ہوں۔ چیزوں کو سمجھ سکتی ہوں۔"

"ہر چیز ویسے نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہی ہو۔ بہت سی باتوں سے تم لاعلم ہو۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں تمہارے اندازے غلط ہیں۔" انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"تو پھر آپ مجھے بتائیں۔ حقیقت کیا ہے۔ کس چیز کے بارے میں میرا اندازہ غلط ہے امی نے کبھی مجھے کچھ نہیں بتایا مگر آپ تو بتا سکتے ہیں۔"

"سارہ! میں تمہارے نانا سے کانٹیکٹ کروں گا لیکن تم یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ صبا یہ نہیں چاہتی تھی کہ تم ان کے پاس رہو۔"

اس کی توقع کے برعکس عارفین عباس نے اس کی بات مان لی تھی اور پھر وہ تیزی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

حیدر نے اس پوری گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا مگر وہ دلچسپی سے دونوں کی باتیں سنتا رہا تھا۔ سارہ نے پہلی بار اسے صحیح معنوں میں چونکایا تھا۔ عارفین کے جانے کے بعد وہ بھی اٹھ کر اندر چلا آیا تھا۔ سارہ دیر تک لان میں بیٹھی رہی۔

اس کی آنکھ کھلتے ہی درد کی ایک لہر اس کے سر سے پیر تک دوڑ گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کہیں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ پورا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح بیٹھنے کے بعد اس نے سر کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پچھلی رات ایک ڈراؤنے خواب کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے رات کے واقعات کو

یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہت دیر تک اسے پیٹتے رہنے کے بعد تایا چلے گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ برآمدوں میں کھڑے لوگ چہ میگوئیاں کرتے ہوئے غائب ہونے لگے۔ ان سب کے جانے کے بعد وہ آہستہ آہستہ کھڑی ہوئی تھی اور کسی نہ کسی طرح خود کو اپنے گھر تک لے آئی تھی۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ کسی کمرے سے امی اور اقصیٰ کے رونے اور عظیم کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں وہ کمرے میں آگئی تھی۔ پتا نہیں کب امی کو اس کے اندر آنے کا پتا چلا تھا اور وہ اونچی آواز میں بولتے ہوئے اس کے کمرے میں آگئی تھیں۔

"منہ کالا کرنے کے بعد یہاں کیا لینے آئی ہو؟ بے غیرت، جاؤ جا کر کہیں ڈوب مر۔"

"منہ کالا میں نے نہیں کیا۔ آپ سب نے مل کر کر دیا ہے۔ عارفین کو آنے دیں۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون۔"

"ہاں آئے گا عارفین۔ ضرور آئے گا تمہارے منہ پر تھوکنے۔ طلاق کے کاغذات تمہارے منہ پر مارنے۔ صبا تو تو میرے گھر کے لئے سانپ سے بھی بڑھ کر زہریلی ثابت ہوئی ہے۔ میں نے پیدا ہوتے ہی تیرا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔"

"گھونٹ تو دیا ہے امی! چند گھنٹے پہلے سب نے مل کر میرا گلا ہی تو گھونٹا ہے۔ اب بچا کیا ہے جس کا واویلا کر رہی ہیں۔"

"اس بے شرم کو دیکھو۔ یہ ابھی بھی مظلوم بن رہی ہے۔ ابھی بھی انکاری ہے۔ میرا بس چلتا صبا! تو میں تجھے سب کے سامنے بیچ صحن میں کوڑے مارتی۔ تو نے اپنا منہ اس دنیا میں خود کالا کیا۔ اگلی دنیا میں اللہ کالا کرے گا۔ تو دیکھنا صبا! کتنی رسوائی ہے تیرے لئے آگے۔"

"اب کوڑوں کی ضرورت نہیں رہی امی! اب کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے

جتنی رسوائی ملنی تھی۔ مل گئی۔ اب دوسروں کی باری ہے۔ آپ کی، اس خاندان کے ہر اس شخص کی جس نے مجھ پر تہمت لگائی۔"

"کتنا جھوٹ بولے گی۔ صبا! تو کتنا جھوٹ بولے گی۔ سب نے دیکھا ہے تجھے عادل کے ساتھ اس کمرے سے نکلتے سب نے دیکھا ہے اور پھر بھی کہتی ہے کہ تو بچی ہے۔"

"ہاں سب نے دیکھا ہے...... سب نے دیکھا ہے، بس اللہ نے نہیں دیکھا۔ تم لوگوں کا دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ لوگوں کے دیکھنے نہ دیکھنے سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

وہ بے ساختہ چلانے لگی تھی۔ اقصیٰ۔ امی کو اس کے کمرے میں سے لے گئی۔ پھر کوئی اس کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ اسے یاد نہیں کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اب صبح ہو چکی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ پردے کھینچ کر اس اندھیرے کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے اب صرف عارفین کا انتظار تھا۔ صرف وہ تھا جو اب اس کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس پر اعتبار کرے گا وہ اسے گناہ گار نہیں سمجھے گا۔

وہ اسی شام آگیا تھا۔ تائی امی کو اس کی آمد کے بارے میں پہلے سے پتا تھا اور جو انہیں اس سے کہنا تھا، وہ سب کچھ بھی طے کر چکی تھیں۔ انہوں نے اس کا استقبال روتے ہوئے کیا تھا اور پھر آنسوؤں اور ہچکیوں کے بیچ اس پر قیامت توڑ دی تھی۔ عارفین کو یقین نہیں آیا تھا۔ وہ سانس روکے بے یقینی کے عالم میں سب کچھ سنتا رہا تھا۔ عادل گھر سے غائب تھا اور سارے ثبوت صبا کے خلاف تھے لیکن وہ ایک بار صبا سے پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ تائی امی سے سارا قصہ سنتے ہی انہی قدموں پر صبا کے گھر آیا تھا اور صبا اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ جو کچھ اس سے پوچھنے آیا تھا اس کا تعلق دل سے نہیں تھا۔

"صبا مجھے بتاؤ۔ تم نے کیا کیا ہے؟" وہ وحشت زدہ تھا۔

"عارفین! میں نے کچھ نہیں کیا۔ یقین کرو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ کیا میں ایسا کر سکتی ہوں؟ کیا میں تمہیں دھوکا دے سکتی ہوں؟"

"لیکن سب لوگ جو کہہ رہے ہیں وہ..."

"سب لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔" اس نے بے اختیار عارفین کی بات کاٹی تھی۔

"کیا آنکھوں دیکھی جھوٹ ہو سکتی ہے۔"

"آنکھیں کچھ نہیں دکھاتیں۔ آنکھیں تو صرف وہ دکھاتی ہیں جو ہمارا دل، ہمارا دماغ دیکھنا چاہتا ہے۔"

"صبا! آج فلاسفی مت بولو۔ آج اس زبان میں بات کرو جو میری سمجھ میں آ جائے جس سے مجھے یقین آ جائے کہ تم بے گناہ ہو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔"

صبا کو اس کے لہجے پر شاک لگا تھا۔ وہ اس دن پہلے کا عارفین نہیں تھا۔ وہ اس کا ساتھ دینے نہیں آیا تھا وہ اس کی پارسائی کا ثبوت لینے آیا تھا۔ اس نے پست آواز میں پورا واقعہ سنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ وہ جان گئی۔ وہ یہ آخری بازی بھی ہار چکی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے، یہ سب میری ماں نے کروایا ہے۔ ہے نا؟"

صبا کی بات ختم ہونے پر اس نے پوچھا تھا۔ وہ چپ رہی تھی جان گئی تھی۔ یہ سوال نہیں تھا۔

"اگر تم اور عادل سچے ہو اور میری ماں جھوٹی ہے تو عادل کہاں بھاگ گیا ہے؟ کیوں بھاگ گیا ہے؟ سامنے کیوں نہیں آتا۔ اپنی بے گناہی ثابت کیوں نہیں کرتا۔" وہ چلا اٹھا۔

وہ چند لمحے کچھ نہیں بول سکی۔ "تو تم نے بھی مان لیا کہ میں..." عارفین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں نے کچھ نہیں مانا مگر تم مجھے اپنی بے گناہی کا ثبوت دو۔ مجھے ثبوت دو اس بات کا کہ یہ سارا منصوبہ میری ماں نے بنایا ہے اور تمہارا عادل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور تم دونوں وہاں..."

وہ بات مکمل کرنے کی بجائے اپنا سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کسی بھی بات کا اور میں پھر بھی کہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ ہاں اللہ کو پتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ اس سے پوچھو۔" وہ اس کی بات پر چلا اٹھا تھا۔

"خدا سے کیسے پوچھوں، میں کوئی پیغمبر ہوں؟"

"لوگ کہتے ہیں۔ اللہ دلوں میں بستا ہے۔ تم اپنے دل سے پوچھو۔"

"میں دل سے کیوں پوچھوں۔ میں تم سے کیوں نہ پوچھوں؟"

"میں سچ کہتی ہوں۔ تم کو اعتبار نہیں آتا۔ میں جھوٹ بولوں گی۔ تمہیں فوراً یقین آ جائے گا۔ تم کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تمہیں لوگوں کی باتوں پر یقین آ چکا ہے۔ مجھ سے تو صرف تصدیق چاہتے ہو۔"

وہ ہونٹ بھینچے ہوئے اسے دیکھتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

"تم چاہتی ہو ناں، اللہ سے پوچھوں، میں اللہ سے ہی ہر بات کا فیصلہ کرواؤں گا۔ قرآن لاؤں گا تمہارے سامنے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر کہو گی کہ تم بے گناہ ہو۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"اگر فیصلہ قرآن پر ہی ہونا ہے تو اپنی ماں کو بھی لاؤ۔ پہلے ان سے کہو کہ وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ انہوں نے مجھے اور عادل کو تمہارے کمرے میں نہیں بھیجا۔ انہوں نے یہ سارا منصوبہ نہیں بنایا اور اگر وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ سب نہ کہیں تو پھر انہیں بھی صحن کے بیچوں بیچ اسی طرح جوتے سے مارا جائے جیسے تمہارے باپ نے

مجھے مارا ہے۔ بولو، لاؤ گے اپنی ماں کو؟

عارفین کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ "لاؤں گا۔ اپنی ماں کو بھی لاؤں گا۔" وہ دروازے سے نکلنے لگا پھر جاتے جاتے رک گیا۔

"اور صبا! اگر تم جھوٹی ہوئیں تو میرا ہر رشتے، ہر چیز سے اعتبار اٹھ جائے گا۔ حتیٰ کہ خدا سے بھی۔" وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

❁

اس دن کے بعد وہ گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ٹیوشن اس نے چھوڑ دی تھی کیونکہ حیدر کو اس بات پر اعتراض تھا کہ وہ اس کے دوست کی بہن کے گھر پڑھانے جاتی ہے اور اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ کسی اور جگہ اس نے ٹیوشن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ منتظر تھی کہ عارفین اس کے نانا سے بات کریں اور اسے کچھ بتائیں مگر انہوں نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ سارا دن گھر میں بے مقصد پھرتی رہتی۔ اس کا دل اب کتابیں پڑھنے میں بھی نہیں لگتا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتی تھی۔ پھر ایک دن عارفین کی سب سے بڑی بہن نے اسے فون کیا تھا۔ اسے ان کا فون اٹینڈ کرتے ہوئے حیرت ہو رہی تھی۔

"سارہ! تم کو میں نے اپنے ہاں آنے کے لئے کہا تھا مگر تم آئیں ہی نہیں۔ میں اس دن سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

اس کے سلام کا جواب دیتے ہی انہوں نے شکوہ کیا تھا۔ اسے ان کی بات پر خوشگوار حیرت ہوئی۔

"آنٹی! میں آنا چاہتی تھی لیکن مجھے آپ کے گھر کا پتہ نہیں ہے، اکیلے میں کیسے آسکتی ہوں۔"

"گھر کا کیا مسئلہ ہے۔ تم حیدر سے کہو۔ وہ تمہیں چھوڑ جائے گا۔" وہ ان کی بات پر

خاموش ہو گئی۔

"میں کسی دن آپ کی طرف آؤں گی۔"

"کسی دن نہیں، میں کل تمہارا انتظار کروں گی۔ تم ضرور آنا۔" انہوں نے اس قدر اصرار کیا تھا کہ اس نے ہامی بھر لی۔ رات کے کھانے پر اس نے عارفین عباس سے اس بات کا ذکر کیا تھا وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور جب اسے یقین ہو گیا کہ انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہیں تو وہ بول اٹھے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ چلی جانا حیدر تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

لیکن پاپا! مجھے تو صبح آفس جانا ہے۔ میں کیسے انہیں چھوڑنے جاسکتا ہوں؟" حیدر پانی پیتے پیتے رک گیا تھا۔

"تم آفس جاتے ہوئے اسے چھوڑ آنا اور لنچ آور میں اسے گھر چھوڑ جانا۔"

عارفین عباس نے خود ہی پروگرام سیٹ کر دیا تھا۔ حیدر خاموش ہو گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے جاتے جاتے کہا تھا۔

"آپ صبح ساڑھے آٹھ بجے تیار رہیے گا۔" اس نے سر ہلا دیا۔

وہ صبح ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تیار ہو کر نیچے آگیا تھا۔ سارہ ناشتہ سے فارغ ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ "چلیں؟" اس نے سارہ کو دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

"آپ ناشتہ نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔" حیدر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج کے دروازے کی طرف آگئی۔ حیدر نے لاؤنج کا دروازہ کھولا تھا اور خود باہر نکلنے کے بجائے اسے پہلے نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔ سارہ نے قدرے حیرت سے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد حیدر بھی باہر آگیا تھا۔ سارہ لاشعوری طور پر گاڑی کے پچھلے دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی مگر حیدر نے گاڑی

کے اندر بیٹھتے ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ اور بلند آواز میں کہا تھا۔

"میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ میں ڈرائیور نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو آگے بیٹھنا ہوگا۔"

سارہ کچھ جھینپ کر آگے بیٹھ گئی تھی۔ چند منٹوں بعد گاڑی سڑک پر آگئی تھی۔

"آپ کہاں جاب کرتے ہیں؟"

"ٹرینی" کے طور پر سٹی بینک میں کام کر رہا ہوں۔"

یہ واحد سوال و جواب تھا۔ جو پندرہ منٹ کے اس سفر میں دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک پرانی لیکن وسیع عمارت کے باہر رک گئی تھی۔

"اندر جا کر دائیں طرف جو گھر ہے وہیں پر میری دونوں پھوپھیاں رہتی ہیں۔"

حیدر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا تھا۔ وہ اس اطلاع پر کچھ حیران ہوئی تھی۔

"دونوں پھوپھیاں؟"

"اصل میں یہ گھر میرے دادا کا ہے۔ بڑی پھوپھی کافی سال پہلے بیوہ ہو گئی تھیں اور چھوٹی پھوپھو کو ڈائیورس ہو گئی تھی تب سے وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ یہیں رہتی ہیں۔" حیدر نے وضاحت کی تھی۔ "لیکن اب میں اکیلے اندر کیسے جاؤں؟" وہ کچھ نروس ہو رہی تھی۔

حیدر نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ ""کیوں اکیلے جانے سے کیا ہوگا۔ خیر میں آپ کو اندر چھوڑ آتا ہوں۔"

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔ سارہ بھی گاڑی سے باہر نکل آئی۔ حیدر گیٹ کی طرف بڑھا تھا اور اسے کھول دیا تھا۔ ایک بار پھر پہلے کی طرح اس نے سارہ سے آگے بڑھنے کے لئے کہا تھا۔ سارہ نے دلچسپی سے ان ایک جیسی عمارتوں کو دیکھا تھا جو اس احاطے کے چار کونوں میں ایستادہ تھیں۔ طویل لان عبور کر کے وہ دائیں

جانب والی عمارت کی طرف مڑ گئے۔ اندر جاتے ہی اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی جب اس نے عارفین کی سب سے بڑی بہن کو اپنا منتظر پایا تھا۔

"عارفین نے مجھے رات کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ تم حیدر کے ساتھ صبح آؤ گی۔ میں تب سے تمہارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔" انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"میں آپ کو لینے کے لئے ڈیڑھ بجے کے قریب آؤں گا۔" حیدر نے سارہ سے کہا تھا۔

"نہیں۔ سارہ آج نہیں جائے گی۔ وہ آج یہیں رہے گی، تم کل شام کو اسے لے جانا۔" بڑی پھوپھو نے فوراً فیصلہ سنا دیا تھا۔

"کیوں سارہ؟" حیدر نے اس سے پوچھا تھا سارہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"نہیں آنٹی میں رات تو نہیں رہ سکتی۔" اس نے کہا تھا۔

"کیوں سارہ رات کیوں نہیں؟ تم جانتی ہو۔ میں آج تمہیں صبا کا گھر بھی دکھاؤں گی۔"

"امی کا گھر۔" سارہ کو یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں تمہاری امی کا گھر۔ یہ ساتھ ہی تو ہے۔" انہوں نے سارہ کا اشتیاق بڑھا دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ آج مجھے لینے نہ آئیں۔ میں آج یہیں رہوں گی۔" اس نے فوراً حیدر کو اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"اچھا پھوپھو! میں اب چلتا ہوں۔" حیدر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے اتنی جلدی۔ بیٹھو، چائے تو پی کر جاؤ۔" انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں پھوپھو! مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ کل شام کو آؤں گا، تب چائے پی کر جاؤں گا۔ اس وقت نہیں۔"

وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تھا۔ وہ اس وقت چائے پی رہی تھی جب عارفین کی دوسری بہن اوپر سے آ گئی تھیں۔ وہ بھی اس سے بڑی محبت سے ملی تھیں۔ چائے پلانے کے بعد بڑی پھوپھو اسے لے کر باقی دونوں گھروں میں گئی تھیں اور کہیں بھی سارہ کو یہ نہیں لگا کہ کوئی اس کی امی سے ناراض تھا۔ ہر جگہ اس کی امی کا ذکر بڑی محبت سے کیا گیا تھا۔

"پتا نہیں امی! آپ کو یہ غلط فہمی کیوں ہو گئی تھی کہ واپس آنے پر آپ کو قبول نہیں کیا جائے گا یہاں پر تو سب آپ کی غلطی بھول چکے ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں ایک بار یہاں آ جاتیں۔" وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی۔

"یہ مجھ سے اتنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں تو کیا یہ امی سے محبت نہیں کرتے ہوں گے لیکن پتا نہیں کیوں انہوں نے ایک غلط فہمی میں اپنی زندگی برباد کر لی۔" وہ اب ماں سے بدگمان ہو رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد بڑی پھوپھو اسے اس کی امی کے گھر لے کر گئی تھیں۔

"تمہاری نانی اور خالہ امریکہ جاتے ہوئے اس گھر کو بیچ دینا چاہتے تھے، تب ابا نے ان کو منع کر دیا۔ بعد میں...... بعد میں۔"

بات کرتے کرتے پتہ نہیں کیوں پھوپھو کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ "بعد میں تمہارے نانا نے اس گھر کو بیچنے پر اصرار کیا تو عارفین نے یہ گھر خرید لیا۔ تب سے اب تک یہ بند ہے۔ وہ یہاں کسی کو رہنے دیتا ہے نہ ہی خود کبھی یہاں آتا ہے۔ اس کی چابیاں میرے پاس ہیں۔ میں ہر ہفتے اسے کھلوا کر صاف کرواتی رہتی ہوں۔"

پھوپھو نے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہا تھا۔ سارہ کو گھر کے اندر داخل ہو کر عجیب سی اپنائیت اور محرومیت کا احساس ہوا تھا۔

"تو امی یہاں رہتی تھیں اور یہ سب کچھ چھوڑ کر انہوں نے اس جھونپڑی کا

انتخاب کیسے کر لیا تھا۔ کیا ان کو کبھی ان آسائشوں کا خیال نہیں آیا۔"

اس نے دیواروں پر لگی پینٹنگز پر نظر دوڑاتے ہوئے سوچا تھا پھوپھو ایک اور کمرے کا دروازہ کھول رہی تھیں۔

"یہ تمہاری امی کا کمرہ ہے۔" انہوں نے دروازہ کھول کر اسے بتایا تھا۔ وہ ایک عجیب سے اشتیاق میں تیزی سے اس کمرے کی طرف آئی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ پھوپھو نے اندر داخل ہو کر پردے ہٹا دیے۔ کمرہ یکدم روشن ہو گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ جو پہلی چیز اس کی نظر میں آئی تھی وہ ایک بہت بڑی اور وزنی سی اسٹڈی ٹیبل اور اس کے پاس دیوار پر لگے ہوئے ریکس پر کتابوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ وہ کچھ بے اختیار سی ہو کر کتابوں کی طرف گئی تھی اور کتابوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اس نے مڑ کر پھوپھو سے پوچھا تھا۔

"امی نے کتنی تعلیم حاصل کی تھی؟"

"وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ انگلش میں ایم۔ اے کر رہی تھی پھر بس...... بس اس نے چھوڑ دیا۔"

پھوپھو یکدم کچھ افسردہ ہو گئی تھیں اور اس کے سر پر جیسے کوئی پہاڑ آن گرا تھا۔

"ایم۔ اے انگلش اور ساری عمر وہ ایک فیکٹری میں دو ہزار روپے کے عوض پیکنگ کا کام کرتی رہیں۔ آخر کیوں؟"

اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ اپنی امی کو فرینچ بولتے سنتی تھی تو اس کا خیال تھا کہ انہوں نے اپنے کسی رشتہ دار سے یہ زبان سیکھی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہیں لیکن ان کے حلیے سے اسے کبھی بھی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کبھی یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں گی۔ ریکس میں ہر طرح کی کتابیں تھیں۔ شیکسپیئر کے ڈراموں سے لے کر وارث شاہ کی ہیر تک، ہارڈی کے ٹیس سے لے کر موپاساں کی کہانیوں تک،

وہاں ہر قسم کی کتاب تھی۔ وہ کچھ افسردگی سے کتابوں کو دیکھتی رہی۔

"امی نے یونیورسٹی کیوں چھوڑ دی؟" ایک بار پھر اس نے مڑ کر پھوپھو سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے اس سے نظریں چرا لیں۔

"پتا نہیں۔" کسے اپنے سوال کا جواب خود ہی مل گیا تھا۔

"وہاں ان کی ملاقات میرے ابو سے ہو گئی ہو گی اور پھر انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔" اس نے سوچا تھا۔

وہ اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پر گرد کی ہلکی ہلکی تہہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے اسے صاف کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھولنا شروع کر دیے تھے۔ وہ لاکڈ نہیں تھے۔ ان کے اندر کارڈز اور خطوط کا ایک ڈھیر تھا۔

"پھوپھو! آپ اگر جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں میں یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں۔" اس نے ان سے کہا تھا۔

وہ کچھ ہچکچائی تھیں۔ "تمہیں اکیلے یہاں ڈر نہیں لگے گا؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"ڈر کس بات کا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔ پھوپھو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ "ہاں اب کس کا ڈر ہو گا۔"

وہ بڑبڑائی تھیں اور کمرے سے نکل گئی تھیں۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

پھر وہ دوبارہ خطوط اور کارڈز کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ زیادہ تر کارڈز اور خطوط فرنچ میں لکھے ہوئے تھے اور وہ لکھنے والے کا نام پڑھ کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ وہ خطوط اور کارڈز عارفین عباس نے لکھے تھے۔ امی نے فرنچ کس سے اور کس کے لیے سیکھی ہو گی۔ عارفین عباس سے ملنے کے بعد یہ راز اس کے لیے راز نہیں رہا

تھا مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ ان دونوں کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت بھی ہوتی ہو گی۔ اس نے ایک خط پڑھنا شروع کیا تھا۔ کاغذ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا اور بعض جگہ پر سیاہی بھی غائب ہو چکی تھی، باری باری اس نے سارے خطوط پڑھنا شروع کر دیے۔ ایک خط کی کچھ لائنیں پڑھ کر وہ ساکت ہو گئی تھی۔

"تم نے اپنے خط میں جو لکھا ہے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ میں بھی رخصتی پر نکاح جیسا ہنگامہ نہیں چاہتا۔ پتہ نہیں ہمارے یہاں شادی جیسے ذاتی معاملہ کو اتنا بڑا ہنگامہ اور تماشا کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ بہر حال تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دسمبر میں جب رخصتی کروانے کے لیے پاکستان آؤں گا تو گھر والوں کو مجبور کروں گا کہ وہ مایوں اور مہندی جیسی رسموں پر وقت ضائع نہ کریں۔ میں جانتا ہوں، تم بھی اپنے گھر والوں کو اس بات پر راضی کر لو گی۔"

"او خدایا! یہ سب کیا ہے؟" وہ بے اختیار سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا عارفین انکل کے ساتھ امی کا نکاح ہوا تھا پھر میرے ابو بیچ میں کہاں سے آ گئے؟" اس نے خط پر تاریخ دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خط اس کی پیدائش سے ڈیڑھ سے پہلے لکھا گیا تھا۔

"کیا امی نے نکاح ہو جانے کے باوجود عارفین انکل کے ساتھ دھوکا کیا تھا؟"

وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ یک دم اس کا دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے وہ خطوط اپنے بیگ میں بھر لیے۔ کارڈز کو دیکھتے ہوئے وہ پھر چونک گئی تھی۔ اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ کچھ کارڈز عارفین عباس نے اس کی امی کو نکاح کے دن کی مبارکباد دینے کے لیے بھیجے تھے۔ اس نے ان کارڈز کو بھی بیگ میں ڈال لیا۔ ماں سے اس کی بدگمانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے باقی کارڈز کو دراز میں رکھ دیا اور دراز بند کر کے باہر نکل آئی۔ پھوپھو وہاں نہیں تھیں۔ شاید وہ اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ اس نے

بیرونی دروازے کو احتیاط سے بند کر دیا اور پھوپھو کے گھر کی طرف چل پڑی۔

شام تک وہ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ پھوپھو کے پاس بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ پانچ بجے خلاف توقع حیدر آ گیا۔ اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔

"پاپا ناراض ہو رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں سارہ کو فوراً لے کر آؤں۔" اس نے آتے ہی پھوپھو سے کہا تھا۔

"لیکن وہ تو یہاں رات رکے گی۔"

"آپ رات کی بات کر رہی ہیں۔ وہ تو اس بات پر مجھ پر بگڑ رہے ہیں کہ میں صبح آدھ میں ان کی ہدایت کے مطابق سارہ کو واپس کیوں نہیں لے کر آیا۔"

"تم نے انہیں بتانا تھا کہ سارہ خود یہاں رہنے پر تیار ہے۔"

پھوپھو! آپ کو پتا ہے پاپا کے غصے کا، جب وہ غصے میں ہوتے ہیں تو کسی کی بات کہاں سنتے ہیں۔ انہوں نے تو میری اتنی انسلٹ کی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے کس کی اجازت سے اسے وہاں رات رکنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ مجھے یہ حق کس نے دیا ہے، میں نے ان سے کہا بھی کہ وہ محترمہ خود تیار ہوئی تھیں رات گزارنے کے لئے مگر ان کا پارہ نیچے نہیں آیا۔ اب براہ مہربانی مس سارہ! آپ چلیں۔"

وہ بڑی بے زاری سے اس سے کہہ رہا تھا۔ سارہ کچھ شرمندگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم آتی جاتی رہنا۔ اب تو تمہیں گھر کا بھی پتہ چل گیا ہے۔"

پھوپھو نے اسے لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بجھے دل سے حیدر کے ساتھ چل پڑی۔ حیدر کا موڈ بری طرح آف تھا۔ وہ گھر آتے ہی سیدھا اوپر چلا گیا اور دوبارہ کھانا کھانے بھی نیچے نہیں آیا۔

عارفین عباس نے اسے کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کے چہرے کے تاثرات سے وہ سمجھ

گئی تھی کہ وہ اس سے بھی زیادہ خوش نہیں ہیں۔ بڑی بے دلی سے اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آتے ہی اس نے اپنے بیگ میں سے وہ خطوط اور کارڈز نکال لئے اور ایک بار پھر سے انہیں پڑھنے لگی۔

صبا کو یقین تھا۔ تائی کبھی قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ عارفین اپنے ماں اور باپ کو لے آیا تھا۔ دوسرے دونوں تایا بھی آ گئے تھے۔ صبا کے کمرے میں کبھی اتنے لوگ نہیں آئے تھے۔ ہر چہرہ تناؤ سے دوچار تھا۔ وہ اٹھ کر وضو کرنے چلی گئی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے وضو کیا تھا۔ پھر چہرہ اور آنکھیں خشک کر کے وہ کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی، یوں جیسے سب لوگ قوت گویائی سے محروم ہو چکے تھے۔ اسے عارفین پر ترس آنے لگا تھا۔

"جب اس کی ماں قرآن پاک پر ہاتھ نہیں رکھے گی تو عارفین کا کیا حال ہو گا۔ وہ کیا کرے گا۔"

اس نے عارفین کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا پھر اس نے تائی کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا، وہ بس سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ عارفین نے اقصیٰ کو قرآن پاک لانے کے لئے کہا تھا۔ صبا نے اپنی امی کو دیکھا وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اقصیٰ قرآن پاک لے آئی تھی۔ عارفین نے قرآن پاک ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرف گیا تھا۔

"امی! آپ قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہیں کہ آپ نے صبا اور عادل کے خلاف کوئی منصوبہ نہیں بنایا اور نہ ہی کل رات ان دونوں کو میرے کمرے میں بھیجا تھا۔"

عارفین نے قرآن پاک ماں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ صبا کے دل کی حرکت تیز ہو گئی پھر اس کا سانس رک گیا تھا۔ تائی امی قرآن پاک ہاتھ میں لے رہی

تھیں۔ اس نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر اس نے ان کو وہی کلمات دہراتے ہوئے سنا جو عارفین نے کہے تھے انہوں نے ایک بار نہیں تین بار جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہی کلمات دہرائے تھے۔

"اللہ!" صبا کو لگا تھا کسی نے اس کے دل میں نیزہ گاڑ دیا تھا۔ اسے یقین تھا وہ کبھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر جھوٹ نہیں بولیں گی۔ اس کا یقین باطل ثابت ہوا تھا۔ اسے ان پر یقین نہیں تھا اسے قرآن پر یقین تھا۔

"کیا کوئی قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹ بولنے کی ہمت کر سکتا ہے؟" اس نے سوچا تھا۔ "اور اب میں بھی قرآن پاک ہاتھ میں لے کر سچ بولوں گی اور اس کمرے میں موجود ہر شخص سوچے گا دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے اور اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر بھی جھوٹ ہی بولا ہے۔"

عارفین نے تائی امی سے قرآن لے لیا تھا۔ اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ ہر نظر اب اس پر جمی تھی۔ وہ رکے ہوئے سانس کے ساتھ اپنی طرف آتے دیکھتی رہی۔ عارفین کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

صبا نے تائی امی کا چہرہ دیکھا۔ کوئی ملال، کوئی رنج، کوئی پچھتاوا، اس چہرے پر کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں بے چینی تھی، آنسو تھے۔ امید تھی۔ اقصیٰ دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ عارفین اس کے پاس آ گیا۔

"صبا! اب تم قرآن پاک ہاتھ میں لے کر کہو کہ تم بے گناہ ہو۔ عادل کے ساتھ وہاں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھیں۔"

اس نے قرآن پاک اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے عارفین کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ عارفین نے نظر چرا لی۔

"یہ لو قرآن پاک۔" اس نے کہا تھا۔ صبا نے سر جھکا دیا اس نے ہاتھ آگے نہیں

بڑھائے عارفین کا سانس رک گیا۔

"صبا! قرآن پاک پکڑو۔" اس نے ایک بار پھر بے تابی سے کہا تھا۔ صبا نے سر اٹھایا تھا نہ ہاتھ بڑھائے تھے۔

"صبا!" امی کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ اقصیٰ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تائی امی دم بخود اسے دیکھ رہی تھیں۔ عارفین تھکے قدموں کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے قرآن پاک اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھ دیا۔ صبا کی امی اور اقصیٰ روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ دونوں تایا بھی اٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔ صبا نے سر اٹھایا تھا۔

"عارفین! مجھے تم سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے نہ میں آئندہ تم سے کوئی مطالبہ کروں گی۔ بس مجھے اپنا نام دے دو، مجھے طلاق مت دینا۔ تم دوسری شادی کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تمہیں نام کی کیا ضرورت ہے؟" وہ غرایا تھا۔

"عارفین! مجھ پر رحم کرو۔"

"تم نے مجھ پر رحم کیا تھا؟ بتاؤ تم نے مجھ پر ترس کھایا؟ پھر میں رحم کیسے کر سکتا ہوں۔ صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش و حواس تمہیں تین بار طلاق دیتا ہوں۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ تائی امی اور تایا بھی اس کے پیچھے چلے گئے تھے۔ وہ ساکت اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

"صبا کریم! میں عارفین عباس علی بقائمی ہوش و حواس تمہیں تین بار طلاق دیتا ہوں"

آواز ایک بار پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹڈی ٹیبل کے پاس آ گئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے قرآن پاک اٹھایا تھا۔

"کسی نہ کسی کو تو قرآن کی حرمت کا پاس رکھنا تھا پھر اگر لوگ مجھے ترک کر دیتے ہیں تو اس پر میرا اختیار نہیں۔" وہ قرآن کو سینے سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

"انکل! مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے۔" اس دن اس نے ناشتے کی میز پر عارفین سے کہا تھا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی امی کے گھر میں رہوں۔ وہ گھر خالی ہے پھر اس طرح آپ کو بھی یہ اعتراض نہیں ہو گا کہ میں کہیں اکیلی رہ رہی ہوں کیونکہ پاس ہی پھوپھو اور دوسرے لوگوں کے گھر ہیں۔"

عارفین اس کی بات پر حیران رہ گئے تھے۔ "سارہ! تم کس طرح کی باتیں سوچتی رہتی ہو۔ اگر تم وہاں سے ہو آئی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم وہاں مستقل رہنے کے بارے میں سوچنے لگو۔ آخر تمہیں اس گھر میں کیا کمی ہے۔ تم یہاں خوش کیوں نہیں ہو؟" انہوں نے ناشتہ چھوڑ دیا تھا۔

"بات خوشی یا ناخوشی کی ہے تو پھر مجھے امی کے گھر میں رہ کر زیادہ خوشی ہو گی۔ اور پھر وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ میں آپ کے ہی گھر میں رہوں گی، چاہے یہاں یا وہاں۔"

"لیکن مجھے تمہارا وہاں رہنا پسند نہیں ہے اور نہ ہی میں تمہیں اس کی اجازت دوں گا۔ اگر صبا زندہ ہوتی تو وہ بھی تمہیں کبھی اس گھر میں جانے نہ دیتی۔"

وہ ان کی بات پر جھنجلا گئی تھی۔ "کیوں آخر وہ کیوں مجھے وہاں جانے نہ دیتیں۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے وہاں۔ ایسا کون سا کام کر دیا ہے انہوں نے کہ وہ دوبارہ کبھی اپنے گھر واپس ہی نہیں آئیں۔ حالانکہ انہیں آنا چاہئے تھا۔ انہیں دیکھنا چاہئے تھا کہ سب لوگ ان کی غلطی کو بھلا چکے ہیں انہیں معاف کر چکے ہیں۔ خاندان کی مرضی کے خلاف شادی نامناسب بات سہی لیکن اتنا بڑا جرم نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان سے کٹ کر رہ جاتیں۔ انہوں نے ساری عمر مجھے بھی تنہائی کے عذاب سے دوچار رکھا لیکن اب میں سب سے ملنا چاہتی ہوں، سب کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

وہ پہلی بار اس طرح جذباتی ہو کر بولی تھی۔ حیدر کو اس پر ترس آیا تھا۔

"پاپا! میرا خیال ہے کہ یہ اگر اپنی امی کے گھر جانا چاہتی ہیں تو یہ کوئی ایسی نامناسب بات نہیں بلکہ میرا خیال ہے، یہاں کے بجائے ان کا وہاں رہنا زیادہ بہتر ہے۔"

"وہ اس کی حمایت میں بولا تھا مگر عارفین عباس نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

You must keep your moulth shut. It is Non of your Buisness.

(تم اپنا منہ بند رکھو، تمہارا اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

حیدر کو توقع نہیں تھی کہ وہ سارہ کے سامنے اس طرح اسے جھڑک دیں گے۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ ناشتہ چھوڑ کر چلا گیا۔

"آپ مجھے بتائیں۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" سارہ ہنوز اپنی بات پر قائم تھی۔

"سارہ! صبا کبھی بھی اتنی معمولی سی بات پر اس طرح ضد نہیں کرتی تھی جس طرح تم کر رہی ہو۔" عارفین نے اس سے کہا تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔

"مگر میں بہت سے ایسے کام نہیں کروں گی جو امی نے کئے۔" وہ اس کی بات پر چونک گئے تھے۔ سارہ نے ان کے چہرے سے نظر ہٹالی۔

"نہیں سارہ! میں تمہیں اس گھر میں کبھی رہنے نہیں دوں گا۔" انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ میرے نانا سے بات کریں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" عارفین بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئے تھے۔ وہ پہلی دفعہ اسے یوں ضد کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے نانا سے بات کروں گا۔"

"آپ مجھے بتائیں کہ آپ کب بات کریں گے؟"

"چند دن تک۔" وہ بے دلی سے کہہ کر ناشتے کی میز سے اٹھ گئے تھے۔

تین دن بعد ایک رات انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

"میں نے تمہاری خالہ سے بات کی ہے۔ تھوڑی دیر میں آپریٹر دوبارہ کال ملا دے گا۔ تم ان سے بات کر لینا۔"

اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی تھی۔ پھر فون کی بیل بجنے لگی تھی۔ عارفین نے فون اٹھایا تھا اور پھر اسے تھما دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ریسیور پکڑا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے کسی عورت کی آواز سنی۔

"ہیلو سارہ!"

"ہیلو۔" اس نے ایک لفظ کہا تھا اور یکدم دوسری طرف سے ہچکیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"میں تمہاری اقصیٰ خالہ ہوں۔ تم کیسی ہو؟" وہ عورت روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ سارہ کا دل بھر آیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

"سارہ میرا دل چاہ رہا ہے، تم میرے پاس ہو تیں اور میں تمہیں گلے لگا کر اتنا پیار کرتی۔ اتنا پیار کرتی......" کسی نے اقصیٰ خالہ کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا اور کوئی انہیں چپ ہو جانے کی تلقین کر رہا تھا۔ پھر اس نے فون پر کسی مرد کی آواز سنی۔

"سارہ! میں تمہارا ماموں ہوں۔ دیکھو تم پریشان مت ہونا نہ ہی کوئی فکر کرنا۔ چند دنوں تک تمہاری اقصیٰ خالہ پاکستان آئیں گی۔ تمہارے کاغذات وغیرہ تیار کروا کر وہ تمہیں اپنے ساتھ امریکہ لے آئیں گی۔"

بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہوں نے اس سے کہا تھا۔ کسی نے اس کی امی کا ذکر کیا تھا نہ اس کی کسی غلطی کا۔ وہ شاید سب کچھ بھلا چکے تھے۔ چند منٹ وہ اس سے گفتگو کرتے رہے تھے پھر انہوں نے اسے خدا حافظ کہا تھا۔ اقصیٰ خالہ ابھی بھی رو رہی

تھیں۔ عظیم ماموں نے فون ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور انہوں نے اسی طرح روتے ہوئے اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے فون بند کر دیا تھا۔

"اقصیٰ کچھ دنوں بعد پاکستان آئیں گی اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گی۔"

اس نے فون کا ریسیور رکھتے ہوئے عارفین عباس کو بتایا تھا۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

"سارہ کیا تم چلی جاؤ گی؟" انہوں نے بے چینی سے اس سے پوچھا تھا۔

"انکل! میں یہاں نہیں رہ سکتی ہوں۔ مجھے اپنی roots (بنیاد) کی طرف جانا ہے۔ وہ سب میرے اپنے ہیں، مجھے ان کی ضرورت ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں ان سے کہا تھا۔

"تم جانتی ہو، صبا تمہیں میرے پاس رکھنا چاہتی تھی۔"

"میں جانتی ہوں لیکن امی کو یہ اندازہ نہیں ہو گا کہ ان کے گھر والے مجھے قبول کر لیں گے۔ وہ امی کی ہر غلطی کو معاف......"

"سارہ اتنی جلدی نتائج اخذ مت کرو۔ تم جو کچھ سمجھ رہی ہو، وہ سب غلط ہے۔" عارفین عباس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پھر آپ مجھے بتائیں۔ حقیقت کیا ہے؟" اس نے ان سے پوچھا تھا۔

وہ بے قراری سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اسے ان پر بے تحاشا ترس آیا۔

"میں جانتی ہوں۔ آپ کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کا دل کتنا بڑا ہے لیکن میں دائمی گھاؤ کی طرح آپ کے پاس رہنا نہیں چاہتی۔ میں چلی جاؤں گی تو آپ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائیں گے۔ باقی زندگی آپ کے اور میرے لئے آسان ہو جائے گی۔ میں یہاں رہوں گی تو نہ آپ ماضی بھول سکیں گے نہ میں اپنی حیثیت۔ مجھے آپ سے محبت ہے عارفین انکل! اسی لئے میں آپ کو ہر اس ذمہ داری

سے آزاد کر دینا چاہتی ہوں جو آئندہ کبھی آپ کو حیدر اور اس کے بیوی بچوں کی نظر میں شرمندہ کرے۔"

سارہ نے دل میں سوچا تھا پھر وہ نم آنکھوں کے سامنے کمرے سے چلی گئی تھی۔

عادل اس رات کے بعد دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے ماں باپ نے ہر جگہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر اس کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ سرمد کی شادی بڑی سادگی اور افسردگی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ سرمد کی شادی کے دوسرے دن تایا نے صبا کی امی کو ایک جگہ اس کا رشتہ طے کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کی امی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

"اس شخص کی عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ ہے اور اس کی پہلی بیوی چند ماہ پہلے فوت ہوئی ہے۔ اس کے چھ بچے ہیں۔ ایک فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے، میں جانتا ہوں یہ کوئی اچھا رشتہ نہیں ہے۔ مگر جو کچھ تمہاری بیٹی کر چکی ہے اب وہ کسی اچھے گھرانے میں بیاہے جانے کے قابل رہی بھی نہیں۔ میں نے اس شخص کو صبا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم جانتی ہو مجھے کسی کو دھوکے میں رکھنا نہیں آتا، وہ شخص تمہاری بیٹی کو پھر بھی قبول کرنے پر تیار ہے۔ تم دعا کرو کہ تمہاری بیٹی اس کے گھر بس جائے۔"

تایا ابا نے صبا کی امی سے کہا تھا۔ وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی تھیں۔

تیسرے روز شام کو تایا اپنے ساتھ اس شخص اور قاضی اور گواہوں کو لائے تھے۔ صبا چیخی چلائی تھی نہ اس نے مزاحمت کی تھی۔ طوفان گزر جانے کے بعد والی خاموشی اور سکون کے ساتھ اس نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ پھر اسی خاموشی کے ساتھ اس نے وہ لباس پہن لیا تھا جو امی اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئی تھیں۔

امی نے اس سے کہا تھا "تم آج آخری دن اس گھر میں ہو، یہاں سے جو کچھ لینا چاہتی ہو لے لو، دوبارہ کبھی تمہیں یہاں نہیں آنا ہے تم ہمارے لئے مر گئیں اور ہم تمہارے لئے مر گئے۔"

"میں واقعی آج مر گئی ہوں اور مرنے والے اپنے ساتھ کچھ لے کر نہیں جایا کرتے۔ ان کی چیزیں خیرات کر دی جاتی ہیں۔ آپ بھی میرا سب کچھ اللہ کے نام پر خیرات کر دیجئے گا جیسے آپ نے مجھے کیا ہے۔"

اس نے اسی سکون سے اپنی ماں سے کہا تھا اور پھر واقعی وہ کچھ لے کر نہیں گئی تھی سوائے ان تین کپڑوں کے جو اس کے جسم پر تھے۔ وہ اپنے کمرے کی ہر چیز اسی طرح کھلی چھوڑ گئی تھی جیسے وہ پہلے پڑی ہوئی تھی۔

عارفین کو اس کی شادی کی خبر ہو گئی تھی مگر اس نے کچھ نہیں کہا تھا کہنے کو اب باقی رہ بھی کیا گیا تھا۔

"تم فکر نہ کرو عارفین! تم دیکھنا، میں تمہارے لئے کیسی پری ڈھونڈتی ہوں۔" تائی امی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں امی! مجھے اب پریوں کی ضرورت نہیں رہی آپ میرے لئے کوئی لڑکی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔"

"تو تم اب اس کے لئے کیا جوگ لے کر بیٹھو گے، کیا تم شادی ہی نہیں کرو گے؟"

"میں نے کب کہا کہ میں جوگ لے کر بیٹھوں گا یا میں شادی نہیں کروں گا، میں شادی ضرور کروں گا لیکن اپنی مرضی سے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے رکھائی سے ماں سے کہا تھا۔

"کیا ابھی بھی مرضی کی شادی کا بھوت سر سے نہیں اترا، دیکھ تو لیا ہے ایسے رشتوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

تائی امی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا، وہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، جانتا تھا اس کے پاس کوئی دلیل نہیں جس کی بنا پر وہ بحث کر سکے۔

چند دنوں کے بعد وہ واپس فرانس چلا گیا۔ دو ماہ بعد اس نے تایا کو اپنی شادی کی تصویروں کے ساتھ شادی کی اطلاع دی تھی۔ پورا خاندان سکتے میں آ گیا تھا، ان کے خاندان میں پہلی بار کسی نے غیر ملکی عورت سے شادی کی تھی۔ ٹریسی اس کے ساتھ اسی پاکستانی بینک میں کام کرتی تھی۔ جس میں وہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے لئے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ اس نے کچھ عرصہ اس سے ملاقاتیں کرتے رہنے کے بعد اسے پروپوز کر دیا تھا۔ ٹریسی نے فوراً اس کا پروپوزل قبول کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور عارفین نے اس کا نام اسماء رکھا تھا۔ اس نے اسماء کو صبا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اسے اپنے ماضی کے بارے میں کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسماء اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ عارفین اپنے انتخاب سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ حیدر کی پیدائش فرانس ہی میں ہوئی تھی اور حیدر کی پیدائش کے بعد اسماء نے جاب چھوڑ دی تھی۔

عارفین کی شادی کے بعد دوسرا دھچکا تائی اور تایا کو تب لگا تھا جب عارفین کی شادی کے ایک ماہ بعد ان کی سب سے بڑی بیٹی اپنے چاروں بچوں کے ساتھ بیوہ ہو کر ان کے در پر آ گئی تھیں۔

تائی امی بالکل گم صم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب انہیں بہت کچھ یاد آنے لگا تھا۔ ان کی راتوں کی نیند غائب ہو گئی تھی۔ وہ ساری ساری رات بیٹھی پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتیں۔

بڑی بیٹی کے بیوہ ہونے کے چار ماہ بعد ان کی دوسری بیٹی بھی طلاق لے کر ان کے گھر آ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے کسی طوائف سے شادی کر لی تھی اور اس کے کہنے پر اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

تایا کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ ان کا غصہ یکدم ختم ہو گیا تھا۔ اور تائی امی۔ تائی امی اب سارا دن عبادت میں مصروف رہتی تھیں وہ کیا پڑھتی تھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ کیا مانگتی تھیں۔ اللہ خوب جانتا تھا۔

صبا کی شادی کے چھ ماہ بعد اس کی امی اور بہن بھائی امریکہ چلے گئے تھے ان کے لئے اس رسوائی کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا جو صبا کی وجہ سے ہوئی تھی۔ صبا کی امی کو اب اقصیٰ کی شادی کرنا تھی اور وہ جانتی تھیں خاندان میں کوئی اس کا رشتہ نہیں لے گا۔ صبا کے ابو نے ان سب کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔

"پاپا آپ ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟" حیدر شام کو گھر آتے ہی سیدھا باپ کے کمرے میں گیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے عارفین کی طبیعت خراب تھی۔

"ہاں۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، بس بلڈ پریشر کچھ ہائی تھا۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے۔" حیدر کو وہ بہت تھکے ہوئے لگے۔ وہ ان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"پاپا! اگر سارہ اپنے گھر والوں کے پاس چلی جائے گی تو اس میں اتنی پریشانی والی کون سی بات ہے۔ اسے آج نہیں تو کل یہاں سے جانا ہی تھا اور جس طرح اس کی خالہ یا ماموں اس کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ اس طرح میں یا آپ نہیں رکھ سکتے۔ پھر اتنی سی بات پر آپ نے اتنی ٹینشن کیوں لے لی ہے؟"

وہ ان کی طبیعت کی خرابی کی وجہ جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سارہ کے جانے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہیں۔ عارفین نے نیوز پیپر تہہ کر کے میز پر رکھ دیا۔

"حیدر! وہ سارہ کو دوبارہ مجھ سے ملنے نہیں دیں گے۔" انہوں نے پہلی بار اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"کیوں ملنے نہیں دیں گے؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ اسے دوبارہ پاکستان میرے پاس نہیں آنے دیں گے۔ پہلے صبا چلی گئی تھی۔ اب سارہ چلی جائے گی۔ میں ساری زندگی ضمیر کی آگ میں جلتا رہوں گا۔" عارفین عباس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

"پاپا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ ان کی بات نہیں سمجھا تھا۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لے کر چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"پاپا! اگر سارہ دوبارہ ہم سے نہیں ملتی تو بھی کیا ہے۔ اسے ہمارے پاس رہتے تین ماہ تو ہوئے ہیں ہم دونوں پہلے بھی اکیلے رہتے تھے۔ اب بھی رہیں گے۔ اس میں پرابلم کیا ہے؟"

"پہلے کی بات اور تھی حیدر! اب مجھے اس کے جانے سے وحشت ہو رہی ہے۔ میں اس کے وجود کے بغیر اس گھر کا تصور نہیں کر سکتا میں اسے ہمیشہ کے لئے یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔" وہ بے حد بے چین تھے۔

"پاپا! آپ اسے کبھی بھی ہمیشہ کے لئے نہیں رکھ سکتے۔ اگر آپ اسے کسی نہ کسی طرح یہاں رہنے پر مجبور کر بھی لیں تو بھی ایک نہ ایک دن تو آپ کو اس کی شادی کرنا ہی ہو گی پھر آپ کیا کریں گے۔ میں آپ کے اور صبا کے بارے میں سب نہیں جانتا ہوں جو کچھ آپ نے مجھے بتایا تھا اس کے حوالے سے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ ماضی کو بھول جائیں۔ صبا مر چکی ہیں اور سارہ یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ ہمیں اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہئے۔" وہ باپ کو کسی بڑے کی طرح سمجھا رہا تھا۔

"حیدر! صبا، سارہ کو میرے سپرد کر کے......"

"ہاں وہ آپ کے سپرد کر کے گئی تھیں مگر وہ یہ بھول گئی تھیں کہ سارہ کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے جسے ایک گارجین کی ضرورت ہو گی۔ وہ بالغ ہے۔ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور ہم اسے روک نہیں سکتے۔"

عارفین نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ "حیدر! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس سے شادی کر لو۔" انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا تھا وہ ان کی بات پر دم بخود رہ گیا۔

"پاپا؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں حیدر! تم اس سے شادی کر لو۔ اس طرح تو وہ یہاں رہ سکتی ہے۔"

"پاپا! میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں کیا تم کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہو؟" عارفین نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"نہیں پاپا! آپ جانتے ہیں میرا Passion (عشق) صرف میرا پروفیشن ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ آج بھی کہتا ہوں کہ شادی میں آپ کی پسند سے کروں گا۔ لیکن میں اس وقت شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے، ایک ٹاپ بینکر بننا ہے۔ اس اسٹیج پر شادی کر کے میں اپنا فیوچر تباہ نہیں کر سکتا۔" اس نے بڑی رسانیت سے باپ کو سمجھایا تھا۔

"تمہارا فیوچر برباد ہو گا نہ کیریر۔ سارہ سے شادی سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا پھر میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تمہیں کس چیز کی فکر ہے۔ میں ہوں نا تم دونوں کو سپورٹ کرنے کے لئے۔"

"پاپا! شادی صرف میری رضامندی سے نہیں ہو سکتی۔ سارہ کا راضی ہونا بھی ضروری ہے۔ میں اگر شادی پر مان بھی جاؤں تو کیا وہ راضی ہو گی؟" حیدر الجھن میں پڑ گیا تھا۔

"تم سارہ کی فکر مت کرو۔ میں اس سے بات کر لوں گا۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں تو اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں۔"

"حیدر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا تھا۔

"پاپا میں شادی ابھی نہیں کر سکتا۔ شادی تین چار سال بعد ہی کروں گا ہاں آپ

انگیجمنٹ کرنا چاہتے ہیں تو وہ کر دیں مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔"

عارفین عباس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ "تھینک یو حیدر! تم دیکھنا سارہ بہت اچھی بیوی ثابت ہو گی۔"

حیدر کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

❁

"کوئی صبا کو بلا دو۔ خدا کے لئے کوئی ایک بار صبا کو بلا دے۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں تاکہ میں سکون سے مر سکوں عارفین! تم ہی جاؤ۔ تم ہی اسے بلا لاؤ۔ اس سے کہو۔ مجھے آکر جوتے مارے۔ اس سے کہو آکر میرے منہ پر تھوکے۔ مجھے گالیاں دے کچھ تو کرے مگر ایک بار آجائے۔ مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔ اس سے کہو اللہ کے نام پر مجھے معاف کر دے۔ ایک بار کہہ دے کہ اس نے مجھے معاف کیا۔ عارفین! ایک دفعہ اسے لے آؤ۔ خدا کے لئے ایک بار......"

تائی امی تکلیف کی شدت سے اپنی بات مکمل نہیں کر پائی تھیں۔ وہ کراہنے لگی تھیں پھر وہ پہلے کی طرح غشی میں چلی گئیں۔ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"عارفین! تم صبا کو لینے جاؤ۔ وہ کسی کے جانے پر نہیں آرہی۔ وہ دروازہ بند کر لیتی ہے۔ وہ نہیں آئے گی تو تمہاری ماں اسی جاں کنی کے عالم میں رہے گی۔ اسے اب صحت یاب نہیں ہونا ہے۔ بہتر ہے وہ مر جائے تاکہ اس تکلیف سے اس کی جان چھوٹ جائے لیکن صبا نہیں آئے گی تو وہ اسی عذاب میں رہے گی۔ تم جاؤ تمہارے...... تمہارے کہنے پر وہ آجائے گی۔"

اسے اپنی پشت پر باپ کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے صحن کو دیکھا باہر سکوت تھا۔ اندر سے ایک بار پھر اس کی ماں کے کراہنے کی آواز آنے

لگی تھی۔ وہ ایک دن پہلے تین سال بعد پاکستان آیا تھا۔ تایا نے اسے اس کی ماں کی بیماری کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اور اب بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ پچھلے دو سال سے بیمار تھیں اور وہ اس بات سے لاعلم نہیں تھا لیکن وہ خود آنے کے بجائے ایک لمبی چوڑی رقم بھیج دیتا تھا مگر اب اسے آنا ہی پڑا تھا۔ وہ اسماء اور حیدر کو بھی ساتھ لایا تھا تاکہ امی مرنے سے پہلے انہیں دیکھ سکیں۔ اور یہاں پر اس کے لئے شاک موجود تھا۔

تین ماہ پہلے تائی امی نے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ انہوں نے قرآن پر جھوٹا حلف اٹھایا تھا اور انہوں نے صبا کو جان بوجھ کر اس منصوبے کا شکار بنایا تھا۔

عادل ڈیڑھ سال پہلے گھر آگیا تھا اور تین سال مجرموں کی طرح گزارنے کے بعد تائی نے اس سے اور اس کے ماں باپ سے معافی مانگ لی تھی۔ شاید وہ معاف نہ کرتے مگر تائی کی حالت اب بیماری کی وجہ سے اتنی خراب ہو چکی تھی کہ انہوں نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے انہیں معاف کر دیا تھا۔ اور پھر صبا کی تلاش شروع ہوئی تھی اور تب تایا کو پتا چلا تھا کہ اس کا شوہر صبا کی بیٹی کو اپنی اولاد ماننے پر تیار نہیں تھا اور اس نے سارہ کی پیدائش سے چھ ماہ پہلے ہی اسے طلاق دے دی تھی۔

"میں نے صبا کے بارے میں تمہیں سب کچھ اس لئے بتایا ہے تاکہ تم کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہم نے تمہیں کوئی دھوکا دیا۔" تایا کو یاد آیا تھا انہوں نے شادی سے پہلے صبا کے شوہر سے یہ سب کہا تھا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گھر کی بنیاد پانی پر رکھی تھی۔

"ایک تہمت میری بیوی نے لگائی۔ دوسری تہمت کا حصہ دار میں بن گیا؟" وہ لرز کر رہ گئے تھے۔

چند ہفتوں کی تلاش کے بعد وہ صبا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ کسی

ہاسپٹل کے رہائشی علاقے میں کسی ڈاکٹر کے ہاں کام کرتی تھی مگر صبا نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر وہ اس علاقے میں گئے تھے جہاں وہ رہتی تھی مگر اس نے ان کی آواز پہچان کر دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ دیر تک دروازہ بجاتے، اسے آوازیں دیتے رہے مگر گھر کے اندر مکمل خاموشی رہی تھی۔ وہ تھک ہار کر لوٹ آئے تھے۔ اس نے یہ سلوک صرف ان ہی کے ساتھ نہیں کیا تھا بلکہ جو بھی اس کے پاس گیا تھا اس نے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ عارفین سب کچھ جان کر سکتے میں رہ گیا تھا۔

"میں بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

"میں سچ بولتی ہوں۔ تمہیں اعتبار نہیں آتا۔ میں جھوٹ بولوں گی تم یقین کر لو گے۔ تم پہلے ہی دوسروں کی باتوں پر یقین کر چکے ہو۔ مجھ سے تو تم صرف تصدیق چاہتے ہو۔"

"اللہ دلوں میں بستا ہے تم اپنے دل سے پوچھو، میں بے گناہ ہوں یا نہیں۔"

ایک آواز اس کی سماعتوں میں رقص کرنے لگی تھی۔ وہ آواز کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا، وہ بستر مرگ پر پڑی ہوئی ماں کو کھلے عام ملامت بھی نہیں کر سکتا تھا اور اسے صبا کے سامنے بھی جانا تھا۔

ہم دیکھیں گے۔

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔

ہم دیکھیں گے۔

وہ دن کہ جس کا وعدہ تھا۔

ہم دیکھیں گے۔

چچا کے گھر ریڈیو پر مغنیہ بلند آواز میں گا رہی تھی۔

"عارفین! تم جاؤ گے نا؟" اسے باپ کی آواز سنائی دی تھی، اس نے بے بسی سے

ہونٹ بھینچ لیے۔

"حیدر سے شادی!" وہ عارفین عباس کی بات پر دم بخود رہ گئی تھی۔

"ہاں، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" عارفین عباس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

اسے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ٹھیک سنا تھا۔

"انکل! مجھ سے کیوں؟" اس نے اپنی حیرت پر قابو پا کر کہا تھا۔

"تم سے کیوں نہیں؟" انہوں نے جواباً سوال کیا تھا۔

"انکل! میرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ یہ رشتہ مناسب نہیں ہے۔" اس نے دیانت داری سے اپنی رائے دی تھی۔

"اس میں کیا کمی ہے؟" انہوں نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"اس میں کوئی کمی نہیں ہے۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔"

"سارہ! تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ تم خوبصورت ہو تعلیم یافتہ ہو۔ سمجھدار ہو۔ کسی بھی مرد کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔" انہوں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"لیکن وہ ان چیزوں میں مجھ سے بہتر ہے اور میں نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا۔"

"تو اب سوچ لو۔"

سارہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا یہ پروپوزل اتنا اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہیں پا رہی تھی۔ عارفین اٹھ کر چلے گئے تھے۔ رات کے کھانے پر وہ بے حد نروس رہی۔ حیدر معمول کی طرح باپ سے باتیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا لیکن اس کا دل کھانے سے بری طرح اچاٹ ہو گیا تھا۔ تین ماہ میں پہلی بار وہ اس پر نظر ڈالنے

سے گریزاں تھی۔ عارفین عباس جب کھانے کی میز سے اٹھ گئے تو اس نے سارہ کو مخاطب کیا تھا۔

"سارہ! اگر مائنڈ نہ کریں تو کل شام میں آپ کو ڈنر پر لے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" وہ کوئی جواب دیے بغیر سر جھکائے نروس سی بیٹھی رہی۔ وہ کچھ دیر اس کے جواب کا منتظر رہا۔

"آپ پانچ بجے تیار رہیے گا۔" اس نے خود ہی کہا تھا اور پھر اوپر چلا گیا تھا۔

اگلی شام پانچ بجے ملازم نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔

"حیدر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے سارہ کو اطلاع دی تھی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے جوتے کے اسٹریپ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جوتا پہننے کے بعد لاؤنج میں آگئی۔ حیدر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"چلیں؟" اس نے پوچھا تھا۔

"آپ نے انکل کو بتا دیا؟"

وہ اس کے سوال پر مسکرا دیا تھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے کیا میں پاپا کی اجازت کے بغیر آپ کو کہیں لے جا سکتا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں میں نے ان سے اجازت لے کر آپ کو ڈنر کی دعوت دی تھی۔" وہ پورچ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"میرے بارے میں آپ زیادہ نہیں جانتی ہوں گی۔ اس لئے بہتر ہے میں اپنے بارے میں آپ کو کچھ بنیادی معلومات دے دوں۔" مین روڈ پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے بات شروع کی تھی۔

"یہ تو آپ کے علم میں ہو گا کہ میری مدر فرنچ تھیں۔ میری پیدائش بھی وہیں ہوئی۔ بارہ سال تک میں وہیں رہا تھا پھر پاپا نے پاکستان میں پوسٹنگ کروالی تو ہم لوگ

یہاں آگئے۔ میں نے اے لیول یہاں سے کیا اس کے بعد میں لندن چلا گیا، وہاں میں نے بزنس مینجمنٹ میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ انٹرن شپ کے تحت ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا رہا پھر پاکستان آکر سٹی بینک جوائن کر لیا۔ پاکستان آئے مجھے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں یعنی آپ کے آنے سے تقریباً تین ماہ پہلے میں واپس آیا تھا۔ میری ممی صرف نام کی فرنچ تھیں۔ پاپا سے شادی کے بعد اور اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے انہوں نے ایسٹرن طور طریقے اپنا لئے تھے۔ اصل میں میری ممی کا تعلق جس خاندان سے تھا وہ کافی کنزرویٹو تھا۔ اس وجہ سے بھی ممی کو پاکستانی ماحول میں ایڈجسٹ کرنے میں کوئی پرابلم نہیں ہوا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا انہیں کبھی مغربی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ یا تو شلوار قمیص پہنتی تھیں یا پھر ساڑھی، میں آپ کو یہ سب اس لئے بتا رہا ہوں تاکہ آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ میں صرف شکل و صورت سے یورپین لگتا ہوں ورنہ میں سوچ کے لحاظ سے بالکل ایسٹرن ہوں۔ باہر رہنے کے باوجود بعض چیزوں کے بارے میں میں بہت لبرل نہیں ہوں۔ میری اپنی ویلیوز ہیں اور میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں بہت سوشل بھی نہیں ہوں۔ میری کمپنی بہت محدود ہے۔ اپ کہہ سکتی ہیں کہ میں سوسائٹی میں موو کرنے کے اعتبار سے خاصا ریزرو ہوں۔ کوایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود مجھے لڑکیوں کی کمپنی کچھ زیادہ پسند نہیں ہے نہ ہی کبھی میری کسی لڑکی سے زیادہ دوستی رہی ہے میری واحد دلچسپی بینکنگ ہے بلکہ آپ کہہ سکتی ہیں یہ میرا واحد شوق ہے۔ ہاں اسپورٹس کا بھی میں شوقین ہوں نہ صرف کھیلنے بلکہ دیکھنے کا بھی۔ آپ کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے تک میری کوئی رائے نہیں تھی۔ میرے لئے آپ بس ایک مہمان تھیں اور میں نے آپ کے بارے میں کبھی بھی اس سے زیادہ نہیں سوچا، میں ایسا سوچنا بھی پسند کرتا بھی نہیں کیونکہ آپ ایک لڑکی تھیں۔ میرے گھر میں تھیں اور مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں آپ کی عزت کروں۔

آپ کو اپنے گھر میں حفاظت سے رکھوں۔ پھر اس کے بعد پاپا سے آپ کی گفتگو سے آپ کے خیالات کا پتا چلا۔ میرے دل میں آپ کی عزت کچھ اور بڑھ گئی چند دن پہلے پاپا نے مجھ سے آپ کے پرپوزل کے حوالے سے بات کی، میں نے اس پر غور کیا اور مجھے لگا کہ آپ ایک بہت اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لئے میں نے پاپا سے کہا کہ مجھے آپ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ پاپا نے اس سلسلے میں آپ سے بات کی۔ آپ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے یہ ضروری سمجھا کہ آپ کو کسی بھی فیصلے سے پہلے اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ مجھے آپ کے بارے میں تقریباً سب کچھ پتا ہے یا کم از کم اندازہ ضرور ہے یہ بھی پتا ہے کہ آپ عمر میں مجھ سے کچھ ماہ بڑی ہیں۔ مجھے آپ کی کسی بات یا ماضی کے کسی حوالے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں۔ پاپا آپ کی امی کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں کی شادی نہیں ہو پائی۔ اب ان کی بھی یہ خواہش ہے کہ آپ کی شادی مجھ سے ہو جائے۔ وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ اسی گھر میں رہیں لیکن آپ کو کچھ اعتراضات تھے جو بڑی حد تک ٹھیک تھے اس پرپوزل کو قبول کرنے کے بعد کم از کم آپ یہ نہیں کہہ سکیں گی کہ آپ کو میرے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں بہت زیادہ امیر نہیں ہوں ابھی میں نے اپنا کیریر شروع کیا ہے لیکن میرا خیال ہے میرے پاس اتنے روپے ضرور ہیں کہ میں آسانی سے آپ کو سپورٹ کر سکوں۔ ہاں جب میں کچھ عرصہ کے بعد اپنا کیریر اسٹیبلش کر لوں گا تو پھر ایک اچھے شوہر کی طرح کوشش کروں گا کہ آپ کو سب کچھ دے سکوں۔ فی الحال میں خود بھی پاپا کے گھر میں رہتا ہوں۔ یہ گاڑی بھی انہوں نے ہی خرید کر دی ہے۔ اس لحاظ سے مالی طور پر میرے حالات بھی آپ جیسے ہی ہیں۔ اگر آپ میرا پرپوزل قبول کر لیتی ہیں تو فی الحال ہماری انگیجمنٹ ہو جائے گی پھر چند سال بعد میں آپ سے شادی کر لوں

گا۔ اس وقت جب کم از کم میرے پاس اپنے روپے سے خریدی ہوئی گاڑی ہو گی۔"

وہ اس کے چہرے پر نظر ڈالے بغیر دھیمے لہجے میں سارہ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتاتا گیا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی تفاخر، کوئی احساس برتری نہیں تھا۔ سارہ کو اس سے ایک عجیب سی مانوسیت کا احساس ہوا۔ وہ چند گھنٹے پہلے ایک پیڈسٹل پر بیٹھا نظر آتا تھا اور اب وہ یکدم جیسے زمین پر اتر آیا تھا۔ اس نے اس کے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں نظر آنے والے کافی کلرڈ بالوں کے Patches کو ایک بار پھر اسی انہماک سے دیکھا تھا جیسے وہ اکثر دیکھا کرتی تھی۔ اس کے بالوں کی طرح اس کی شخصیت بھی عجیب تھی۔

"اب اگر میں آپ سے کہوں کہ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی تو آپ کیا کہیں گی؟"

سارہ نے گردن گھما کر اس کے چہرے کو دیکھا تھا، وہ بے حد پر سکون نظر آرہا تھا۔

"ہاں!" وہ سمجھ نہیں پائی۔ اس کی زبان سے یہ لفظ کیسے پھسل پڑا تھا۔

حیدر کے چہرے پر ایک خوبصورت مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "تھینک یو" اس نے کہا تھا پھر وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا تھا۔ سارہ نہیں جانتی اس کی باتوں میں کیا جادو تھا۔ کیا خاص بات تھی مگر اسے اس سے کوئی گھبراہٹ، کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے مختلف موضوعات پر اس طرح باتیں کرتا رہا تھا جیسے وہ اکثر اسے باہر لے جاتا رہا ہو، اکثر اس سے گفتگو کرتا رہا ہو۔ اس کے انداز میں وہ بے تکلفی تھی جو اپنے باپ سے بات کرتے وقت ہوتی تھی۔ وہ شام سارہ کی زندگی کی بہترین شام تھی۔ اس رات واپسی پر سونے سے پہلے جو واحد تصور اس کے ذہن میں تھا وہ حیدر کا تھا۔

تیسرے روز شام کو ایک سادہ سی تقریب میں عارفین عباس نے باقاعدہ طور پر ان دونوں کی منگنی کر دی تھی۔ منگنی میں صرف عارفین کی بہنیں اور خاندان کے چند

بزرگ شریک ہوئے تھے۔ سارہ چاہتی تھی کہ منگنی اقصیٰ خالہ کے پاکستان آنے کے بعد ہو مگر عارفین کا اصرار تھا کہ یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہئے اور اقصیٰ نے ابھی اپنے آنے کی تاریخ نہیں بتائی، اس لئے بہتر ہے یہ چھوٹی سی رسم ان کی غیر موجودگی میں ہی سرانجام پا جائے۔ سارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات مان گئی تھی۔ عارفین نے اسے فون پر اقصیٰ کو یہ بات بتانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ اس بات سے ہرٹ ہوں گی کہ ان کی مرضی پوچھے بغیر سارہ کی منگنی کر دی گئی ہے اور ان کی آمد کا انتظار بھی نہیں کیا گیا۔

"جب وہ یہاں آئے گی تو میں خود اسے سمجھا دوں گا لیکن فی الحال تم اس سے اس منگنی کا ذکر نہ کرنا۔"

انہوں نے سارہ کو ہدایت دی تھی۔ سارہ نے ان کی بات بخوشی مان لی تھی۔ منگنی کے تین چار دن بعد ایک دن اقصیٰ نے اسے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ تین دن بعد پاکستان آ رہی تھیں۔

❁

وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ زرد رنگت، سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھوں اور ابھری ہڈیوں والا وہ چہرہ صبا کا چہرہ نہیں ہو سکتا تھا مگر وہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جو اسے مسحور کر دیتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے لگا تھا اس کا پورا وجود پانی بن کر بہنے لگا ہو۔ وہ گھر پر نہیں تھی اور وہ شام تک اس کے دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا تھا پھر وہ آ گئی تھی۔ گود میں ایک چھوٹی بچی کو اٹھائے جسم کو ایک کالی چادر میں چھپائے اس نے دروازے پر اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک نظر ڈالنے کے بعد اس نے دوبارہ اس پر نظر نہیں ڈالی تھی۔

"صبا! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

اسے لگا تھا یہ جملہ بولتے ہوئے اس کے حلق میں کتنے ہی کانٹے چبھ گئے تھے۔ وہ خاموش رہی تھی اپنی بچی کو اس نے دہلیز پر بٹھا دیا اور ایک چابی سے تالا کھولنے لگی۔

"صبا! کیا مجھے معاف کر دو گی؟"

تالا کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی بچی کو اٹھایا اور دروازہ کھول کر اندر جانے لگی۔

"صبا! میری بات کا جواب دو۔" عارفین نے دروازہ پکڑ لیا تھا۔

"اندر آ جاؤ یہاں تماشا نہ بناؤ۔" وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے اندر آ گیا تھا۔ اس نے اندر جا کر لائٹ آن کی تھی اور اپنی بچی کو ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔

"کہو کیا چاہتے ہو اب مجھ سے؟" وہ خود کھڑی رہی تھی۔

"صبا! مجھے معاف......"

"میں نے معاف کیا اور؟" صبا نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"کیا تم ایک بار میری ماں سے مل سکتی ہو؟ وہ بہت بیمار ہیں، تم سے معافی مانگنا چاہتی ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گی۔"

اسے بات کرتے کرتے احساس ہوا، وہ اس پر نظر جمائے کھڑی تھی، اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔ اسے یاد آ گیا تھا۔ طلاق دیتے وقت بھی وہ اسے اسی طرح دیکھ رہی تھی۔

"صبا! جو میں نے تمہارے ساتھ کیا، وہ تم میرے ساتھ مت کرنا۔" وہ آہستہ سے گڑگڑایا تھا۔

"میں آ جاؤں گی، اب تم جاؤ" وہ اپنی بچی کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

عارفین کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے حلق پر پاؤں رکھ کر زور زور سے پیر دبانا شروع کر دیا تھا۔

"صبا تم چیخو چلاؤ۔ مجھے گالیاں دو۔ کہو میں نہیں آؤں گی۔ تمہاری ماں مرتی ہے تو مر جائے۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے کچھ تو کہو مگر یوں میری بات نہ مانو۔"

وہ نہیں جانتا۔ اسے کیا ہوا تھا۔ بس وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔ وہ چپ رہی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو گود میں بٹھا لیا تھا۔ عارفین کو یاد تھا وہ چھوٹی چھوٹی بات پر رو پڑتی تھی۔ ذرا سی بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ آج اسے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس طرح اسے دیکھ رہی تھی جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ کتنی ہی دیر روتا رہا تھا پھر آستینوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے وہاں سے آ گیا تھا۔

وہ دوسرے دن سہ پہر کو آئی تھی۔ عارفین ماں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ تائی امی کراہ رہی تھی۔ اس نے اسے دروازے پر کھڑے دیکھ لیا تھا۔ وہ کل کی طرح آج بھی اپنی بیٹی کو اٹھائے ہوئے تھی۔

تایا ابا نے اسے دیکھا تو بے اختیار اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ "صبا! آؤ اندر آؤ۔"

وہ اندر آ گئی تھی۔ تایا نے اسے گلے لگانا چاہا تھا۔ اس نے بڑے سکون سے انہیں ہاتھ سے روک دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

عارفین نے اسے کہتے سنا تھا۔ پتا نہیں کس طرح سب گھروں میں اس کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کے پیچھے لوگ آنے لگے تھے۔ کمرہ لوگوں سے بھرنے لگا تھا۔

"امی! صبا آئی ہے۔" عارفین نے ماں کو اطلاع دی تھی۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھ گیا

"کہاں ہے صبا؟ کہاں ہے وہ؟ اسے میرے سامنے لاؤ۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اسے۔" تائی نے اٹھنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی لیکن ان سے اٹھا نہیں گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تھی تائی نے

اسے دیکھ لیا تھا۔ یکدم وہ خاموش ہو گئی تھیں لیکن ان کا جسم لرز رہا تھا، ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر سب نے دیکھا تھا انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے تھے۔ صبا نے بڑے سکون سے ان کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے تھے۔

"میں نے آپ کو معاف کیا۔ میرے دل میں آپ کے خلاف کچھ نہیں ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تائی امی نے یکدم بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے تم پر بہت ظلم......" تایا آگے آ گئے تھے۔ صبا نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں نے آپ کو بھی معاف کیا۔ میں نے سب کو معاف کیا۔" اس نے کہا تھا اور پھر وہ اپنی بچی کو اٹھائے دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"صبا! تم کہیں مت جاؤ۔ تم ہمارے پاس رہو۔ اپنے گھر آ جاؤ۔" چھوٹے تایا نے اسے روکنا چاہا تھا۔

"تایا! مجھے رہنے کے لیے گھر نہیں جگہ چاہیے، وہ میرے پاس ہے۔" وہ رکی نہیں تھی پھر ہر ایک نے اسے روکنا چاہا تھا۔ تایا اب روتے ہوئے اس کے پیچھے دروازے تک گئے تھے مگر وہ نہیں ٹھہری تھی۔ جس خاموشی سے اور سکون کے ساتھ وہ آئی تھی۔ اسی خاموشی اور سکون کے ساتھ چلی گئی تھی۔

❁

"عارفین! یہ سب نہیں ہو گا۔ کم از کم میری زندگی میں نہیں ہو گا۔ میں تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانے نہیں دوں گی۔ تم ہوتے کون ہو اپنے بیٹے کے ساتھ سارہ کی منگنی کرنے والے؟"

اقصیٰ، عارفین سے یہ سنتے ہی غضب ناک ہو گئی تھیں کہ اس نے سارہ کی منگنی حیدر سے کر دی ہے۔ وہ آج ہی پاکستان آئی تھیں اور آتے ہی سارہ سے ملنے کے لئے

عارفین کے ہاں گئی تھیں اگر سارہ وہاں نہ ہوتی تو وہ کبھی عارفین کے ہاں نہ جاتیں۔ دل میں کچھ ایسی ہی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ سارہ سے ملانے کے بعد عارفین ان سے کوئی ضروری بات کرنے کے لئے اپنے کمرے میں لے آئے تھے اور وہاں انہوں نے سارہ کی منگنی کا انکشاف کر دیا تھا۔

"اقصیٰ! جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں پھر صبا خود سارہ کو میرے حوالے کر کے گئی ہے۔"

عارفین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہر غلطی کا ازالہ نہیں کیا جا سکتا اور تم لوگوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ تم لوگوں نے گناہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ صبا اسے تمہارے سپرد کر کے گئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اس کی سادگی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اسے بار بار اعتبار کرنے کی عادت تھی۔ اسے بار بار معاف کرنے کی عادت تھی اور اسی عادت نے اسے اس عمر میں قبر میں پہنچا دیا۔ مجھ میں یہ دونوں عادتیں نہیں ہیں اور میں سارہ کے ساتھ وہ سب نہیں ہونے دوں گی جو آپی کے ساتھ ہوا۔"

"اقصیٰ! تم جانتی ہو، جو کچھ ہوا۔ اس میں میرا قصور بہت کم تھا پھر بھی......"

"کم تھا یا زیادہ تھا۔ تمہارا قصور تھا مگر صبا کا تو کوئی قصور نہیں تھا پھر اس نے کس جرم کی سزا کاٹی۔ نہیں عارفین! میں سارہ کو تمہارے خاندان میں نہیں آنے دوں گی۔"

"اقصیٰ! یہ منگنی صرف حیدر کی مرضی سے نہیں ہو رہی، اس میں سارہ کی پسند بھی شامل ہے۔ تم یہ رشتہ توڑ کر اسے تکلیف پہنچاؤ گی۔" عارفین اقصیٰ کے سامنے بے بس نظر آ رہے تھے۔

"سارہ کی پسند...... سارہ کو ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہو گا ورنہ وہ تمہارے بیٹے پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔" اقصیٰ کے لہجے کا زہر بڑھتا ہی گیا تھا۔

عارفین نے سر جھکا لیا۔ "میں اسے سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ خود یہ رشتہ توڑ کر جائے گی۔"

"اقصیٰ! یہ مت کرنا۔ صبا نے اس سے سب کچھ چھپا کر رکھا ہے پھر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے اس سے کچھ کہنے کا۔ تم فرنچ نہیں جانتی ہو لیکن یہ خط کسی سے پڑھوا لو، دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔ سارہ کو اپنے پاس رکھ لینا۔ اسے میرے خاندان کے پاس مت بھیجنا۔ ماضی دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا۔" یہ سب میں نے نہیں لکھا۔ اس نے لکھا ہے اقصیٰ! یہ یاد رکھو، وہ مجھے اور میرے گھر والوں کو معاف کر چکی تھی لیکن اس نے تم لوگوں کو معاف نہیں کیا تھا جو کچھ میرے خاندان نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ تم سب نے بھی وہی کیا تھا۔ تم لوگوں نے بھی اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی زندگی برباد ہوئی تو اس میں تم لوگوں کا بھی حصہ ہے۔ کیوں اس کی شادی ہونے دی؟ کیوں نہیں اسے بچایا؟ کیوں اسے تباہ ہونے دیا۔" عارفین بھی بگڑ گئے تھے۔

"اقصیٰ! اب ماضی کو ماضی ہی رہنے دو۔ سارہ کو پچھلے چوبیس سال سے کچھ نہیں ملا۔ اب اگر اسے کچھ مل رہا ہے تو اسے اس سے مت چھینو۔ اسے صبا کا ماضی بتا کر تم باقی زندگی کے لئے رلاتی رہو گی یہ سب مت کرو۔" اقصیٰ اس کی بات پر خاموش ہو گئی تھیں۔

"سارہ! تم نے مجھے فون پر نہیں بتایا کہ تمہاری منگنی ہو گئی ہے؟" عارفین کے کمرے سے نکل کر واپس جاتے ہوئے اقصیٰ نے سارہ سے پوچھا تھا وہ اس سوال پر اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی دھنک دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔

"میں بتانا چاہتی تھی لیکن عارفین انکل نے منع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ خود آپ کو یہ سب بتائیں گے۔ میں تو منگنی بھی آپ کے پاکستان آنے کے بعد ہی کرنا چاہتی تھی لیکن عارفین انکل کو جلدی تھی۔" اس نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

اقصیٰ نے عارفین کو دیکھا تھا۔ وہ نظر چرا گئے تھے۔

"تم حیدر کو پسند کرتی ہو؟" انہوں نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ مزید جھینپ گئی تھی اس کے چہرے پر پھیلتی شفق نے اقصیٰ کا چہرہ تاریک کر دیا تھا۔

"انہیں یاد آیا تھا، عارفین کے ذکر پر صبا بھی اسی طرح گلابی پڑ جاتی تھی۔ اس کی جھینپی ہوئی مسکراہٹ نے اقصیٰ کو بے اختیار صبا کی یاد دلائی تھی۔

"شادی کب کرو گے؟" اقصیٰ نے عارفین سے پوچھا تھا۔

"چند سال بعد۔"

"ٹھیک ہے اتنے سال سارہ میرے پاس رہے گی۔"

"نہیں اقصیٰ! سارہ یہیں رہے گی۔" عارفین اس کی بات پر کچھ پریشان ہو گئے تھے۔

"شادی سے پہلے یہاں کس حیثیت سے رہے گی؟"

"جیسے پہلے رہ رہی تھی۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب حیدر سے منگنی کے بعد تو اس کے یہاں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم یا تو اسے میرے ساتھ جانے دو یا پھر باقاعدہ اس کی شادی کروا کر اسے اپنے گھر لاؤ۔"

اقصیٰ نے وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ سارہ اقصیٰ کی ضد پر دم بخود ہو گئی تھی۔ عارفین بھی خاموش تھے۔

"ٹھیک ہے۔ میں حیدر سے بات کرتا ہوں اور پھر کل تمہیں بتا دوں گا۔" انہوں نے اقصیٰ سے کہا تھا۔

"سارہ تم اپنا سامان پیک کر لینا۔ کل میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔" اقصیٰ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"اقصیٰ! تم ہوٹل میں رہنے کے بجائے یہاں آسکتی ہو یا پھر اپنے گھر جا سکتی ہو۔ وہ ابھی بھی خالی ہے۔" عارفین نے اقصیٰ کو آفر کی تھی انہوں نے چند لمحے اس پر سوچا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اپنے گھر میں رہوں گی۔" انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"میں آپا کو اطلاع دے دوں گا۔ تم جب چاہے وہاں چلی جانا۔" عارفین اسے گاڑی تک چھوڑنے آئے تھے۔

❁

"صبا! اس طرح اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ یہاں سے چلو، تم اس طرح ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں بنائی گئی ہو، میں نے فون پر چچا سے بات کی ہے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے وہ اگلے ہفتے پاکستان آ رہے ہیں اگر ہمارے ساتھ نہیں تو ان کے ساتھ چلی جاؤ مگر اس طرح دھکے نہیں کھاؤ۔"

وہ اپنی ماں کے مرنے کے چھ دن بعد ایک بار پھر اس کے پاس گیا تھا۔

"یہ میری زندگی ہے۔ میں جیسے چاہوں گی، اسے گزاروں گی۔" وہ آج بھی اسی طرح سرد تھی۔

"تم اس طرح زندگی گزارو گی تو ہم میں سے کوئی بھی سکون سے نہیں رہ سکے گا۔"

"سب سکون سے ہیں۔ سب خوش ہیں۔ کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بس ایک مجھے برباد کرنا تھا۔ سو سب نے مل کر کر لیا۔" عارفین نے اس کی زبان پر شکوہ سن لیا تھا۔

"تم برباد نہیں ہو گی صبا! میں تم سے شادی کروں گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" عارفین نے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"اور اسماء اور حیدر، ان کا کیا ہو گا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"اسماء مان جائے گی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" عارفین نے بڑے یقین سے کہا تھا۔

"مجھے لوگوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچنا نہیں آتا۔ ایسا کر بھی لوں تو

مجھے اس پر پیر جمانا نہیں آئے گا۔ تم نے تین سال پہلے مجھے گندگی سمجھ کر جھٹک دیا تھا۔ مجھے آج بھی اپنا وجود گندگی ہی لگتا ہے۔ تم ایک اچھی زندگی گزار رہے ہو۔ گزارو۔ مجھے دوسروں کی چادر کھینچ کر اپنا وجود ڈھانپنا نہیں آتا۔"

وہ ابھی بھی وہی صبا تھی۔ تین سال پہلے والی۔ ظاہر بدل گیا تھا۔ باطن کیسے بدل جاتا۔

"ٹھیک ہے...... مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں نہ کرو، اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤ، اپنا نہیں تو سارہ کا ہی سوچو۔" عارفین نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"اسی کا تو خیال ہے مجھے اب۔ میرا دل اپنے گھر والوں کے پاس جانے کو نہیں چاہتا۔ وہ مجھے قبول کرلیں گے۔ سارہ کو نہیں۔ یہ انہیں بوجھ ہی لگے گی۔ وہ اس سے نفرت کریں گے تم جانتے ہو، سارہ کے باپ نے اسے اپنی بیٹی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے اسی وجہ سے طلاق دی تھی۔ مرد طوائف کو بسا لیتا ہے تہمت لگی ہوئی عورت کو نہیں۔ کل کو سارہ بڑی ہوگی اگر کسی نے اسے یہ سب بتادیا تو وہ کیا کرے گی۔ جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں میرا قصور نہیں تھا لیکن مجھے سزا ملی جو کچھ ہوا تھا۔ اس میں سارہ کی بھی غلطی نہیں ہے لیکن میں چاہتی ہوں میری طرح اسے سزا نہ ملے۔"

"سب کا خیال ہے تمہیں بس اپنا خیال نہیں ہے؟"

"میرا خیال اللہ نے نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔ مجھے لگتا ہے عارفین! میں نے ضرور کوئی گناہ کیا ہے۔ خدا کسی کو گناہ کے بغیر اتنی رسوائی نہیں دیتا جتنی اس نے مجھے دی ہے۔ تین سال پہلے میرا جب جی چاہتا تھا میں اس سے باتیں کرتی تھی۔ تین سال سے اس نے مجھ سے بات کرنا بند کردیا ہے۔ میں تین سال سے اسے آوازیں دے رہی ہوں مگر وہ جواب نہیں دیتا۔ میں تین سال سے ہر وہ کام کر رہی ہوں جو اسے خوش کر دے۔ اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے دیکھ لو۔ میں نے صبر کیا ہے۔ میں کسی سے

شکوہ نہیں کرتی۔ میں نے تین سال میں ایک بار بھی کسی کو یہ سب کچھ نہیں بتایا مگر وہ پھر بھی راضی نہیں ہوا۔ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ میں نے سب کو معاف کردیا۔ تم کو، تائی امی کو، تایا ابا کو، امین کو، سب کو مگر وہ پھر بھی مجھ سے خفا ہے۔ اللہ کو عاجزی پسند ہے۔ میرا دل چاہتا ہے میں مٹی بن جاؤں۔ لوگوں کے پیروں کے نیچے آؤں۔ مسلی جاؤں پھر وہ مجھ پر اپنی نظر کردے مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے عارفین! میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ کوئی گناہ تو ضرور کیا ہے۔"

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ عارفین اس کے آنسو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے شکوہ سننا چاہتا تھا مگر اب اس کی ہر بات اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا رہی تھی۔

"تم ایسی باتیں نہ کرو صبا! تم ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہاری ایسی باتوں نے کتنوں کی زندگیاں اجاڑ دی ہیں۔ تمہارے ان آنسوؤں کی وجہ سے اللہ نے کتنوں کو خون کے آنسو رلایا ہے۔ تم صبر نہ کرو، شکوہ کرو۔ معاف نہ کرو، بدلہ لو۔ تم ایسا کرو گی تو بہت سی زندگیاں تباہ ہونے سے بچ جائیں گی۔" کوئی اس کے وجود کے اندر چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

"صبا! مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لئے کیا کروں؟" عارفین اس کے قریب آگیا تھا۔

"تم۔ تم بس ایک کام کرنا۔ دوبارہ کبھی میرے پاس مت آنا نہ مجھ سے رابطہ کرنا نہ مجھے ڈھونڈنا۔ بس میرے لئے کچھ کرنا ہے تو یہی کرنا۔"

وہ اب بھی اسی طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ اس روز وہ چپ نہیں ہوئی تھی، وہ روتی رہی تھی بچوں کی طرح یوں جیسے کسی نے اس سے سب کچھ چھین لیا ہو۔ یوں جیسے کسی نے اسے کچھ نہ دیا ہو۔ عارفین بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا تھا جب اس کے آنسو اس کی برداشت سے باہر ہوگئے تھے تو وہ وہاں سے چلا آیا تھا۔

اگلی شام وہ اس کی ڈگری اور دوسرے کاغذات اس کے گھر سے نکال لایا تھا اور اسے دینے کے لئے گیا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرتا رہا۔ بہت دیر ہوگئی

وہ گھر نہیں آئی۔ وہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے اس کے ہمسایوں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

"وہ تو جی صبح اپنا سامان لے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ چابی ہمیں دے گئی ہیں کہ مالک مکان کو دے دیں۔" ایک عورت نے اس کے استفسار پر اندر سے اسے بتایا تھا۔

کسی نے برچھی سے ایک بار پھر عارفین کے پورے وجود کو چھیدنا شروع کر دیا تھا۔

اس نے دوبارہ صبا کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جانتا تھا، اس بار وہ نہیں ملے گی، صبا کے گھر والے پاکستان آ گئے تھے۔ اور انہوں نے عارفین کے گھر والوں سے سارے تعلقات توڑ لئے تھے۔ لیکن عارفین سے صبا کے والد ناراض نہیں رہ سکے۔ اس نے ان کے پیروں پر گر کر ان سے معافی مانگی تھی۔ واپس امریکہ جاتے ہوئے اس نے ان سے صبا کا گھر خرید لیا تھا۔ پھر وہ خود بھی اسماء اور حیدر کے ساتھ واپس فرانس آ گیا تھا۔ یہاں آ کر اسے شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور دو تین ماہ تک وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے اور وہ کئی کئی دن تک خاموش رہتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اسماء اور حیدر کی وجہ سے نارمل ہونے لگا تھا۔ اسماء نے ان دنوں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ گھنٹوں اس سے صبا کے بارے میں باتیں کرتا رہتا اور وہ بڑے صبر اور ہمدردی سے سنتی رہتی اور جب اس پر خاموشی کے دورے پڑتے تو وہ صبا کا ذکر کر کے اسے بولنے پر مجبور کرتی۔ کئی سال وہ پاکستان نہیں گیا تھا پھر باپ کی وفات پر اس نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

❁

"اس میں اعتراض والی بات کون سی ہے۔ ہر ایک اپنی بچی کا تحفظ چاہتا ہے۔ سارہ کے ماں باپ نہیں ہیں۔ رشتے کے لحاظ سے میں ہی اس کی سرپرست ہوں پھر اگر میں اس کے تحفظ کے لئے ایسی ضمانت چاہتی ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟"

اقصیٰ نے اس کے نکاح سے کچھ دیر پہلے حق مہر میں عارفین کے گھر کا مطالبہ کیا

تھا۔ عارفین نے اس کے مطالبے پر صبا کا گھر سارہ کے نام کر دینے کی پیشکش کی تھی لیکن اقصیٰ صبا کے گھر کے ساتھ ساتھ عارفین کا گھر بھی سارہ کے نام لکھوانا چاہتی تھیں۔ عارفین کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن حیدر اس پر بگڑ گیا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے پاپا؟ یہ ہوتی کون ہیں اس طرح کی ڈیمانڈز کرنے والی؟ پہلے انہوں نے فوری شادی کا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے آپ کے مجبور کرنے پر اس پر رضامندی ظاہر کر دی اور اب یہ حق مہر میں بے جا مطالبات پیش کر رہی ہیں۔ سارہ کے لئے کیا پانچ لاکھ، زیورات اور اس کی امی کا گھر حق مہر میں کافی نہیں ہے جو یہ آپ کے گھر کے لئے کہہ رہی ہیں۔ میں ان کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں مانوں گا۔ چاہے جو مرضی ہو جائے۔ وہ گھر آپ کا ہے اور میں کسی صورت میں کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔ ان کو اگر اتنی چیزیں قبول نہیں ہیں تو یہ اپنی بھانجی کی شادی کہیں اور کر لیں۔"

وہ بے حد برہم تھا اور کسی طور پر عارفین کی بات ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔

"حیدر! تم جذباتی مت ہو۔ یہ گھر سارہ کے نام کر دینے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ گھر میرے نام ہو۔ تمہارے نام ہو یا سارہ کے نام۔ ایک ہی بات ہے۔ رہنا تو ہم تینوں کو ہی ہے یہاں؟" عارفین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"آپ کو فرق پڑتا ہے یا نہیں مجھے پڑتا ہے۔ جو چیز آپ کی محنت کی ہے وہ میں یا میری بیوی کیسے ہتھیا سکتے ہیں۔ انہیں مطالبات میری حیثیت دیکھ کر کرنا چاہئیں آپ کی حیثیت دیکھ کر نہیں۔" وہ ابھی بھی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"حیدر! یہاں مسئلہ سارہ کی ذات کا ہے۔ میں ایک مکان کی خاطر اس کے نکاح پر کوئی جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ اس طرح شادی سے انکار کرنے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر سارہ کو پڑے گا اور میں ایسا کوئی کام نہیں ہونے دوں گا جس سے اس کی فیلنگز ہرٹ ہوں۔"

انہوں نے کسی نہ کسی طرح اسے سمجھا بجھا لیا تھا لیکن حیدر کا دل بری طرح کھٹا ہو چکا تھا۔ وہ پہلے ہی اتنی جلدی شادی کی وجہ سے بہت خوش نہیں تھا اور اب اقصیٰ کے ایسے مطالبات نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ عارفین اس صورت حال سے نہ تو پریشان تھے اور نہ ہی ناخوش۔

اقصیٰ نے واقعی شادی جلدی کرنے کے لئے شور مچایا تھا۔ وہ واپس جانے سے پہلے سارہ کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ عارفین کی رضامندی کے بعد انہوں نے اپنے بھائی اور باپ کو بھی امریکہ سے اپنی فیملی کے ساتھ بلوا لیا تھا۔ عارفین کے انکار کے باوجود ان لوگوں نے سارہ کے لئے جہیز خریدنا شروع کر دیا تھا اور انہوں نے سارہ کے لئے ہر وہ چیز خریدی تھی جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔ نکاح، مہندی سے کچھ دیر پہلے کیا گیا تھا اور دوسری شام سارہ کی رخصتی تھی۔ عارفین کی بڑی بہن نے حق مہر کے سلسلے میں اقصیٰ کے مطالبات سے سارہ کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ جہاں پریشان ہوئی تھی وہیں بے حد شرمندہ بھی تھی۔ نکاح کے بعد جب سب لوگ کمرے سے چلے گئے تو اس نے اقصیٰ سے اس بات کی شکایت کی مگر انہوں نے اس کی بات یہ کہتے ہوئے سنی ان سنی کر دی۔

”تم ابھی چھوٹی ہو، دنیا کو سمجھ نہیں سکتی ہو۔ میں نے جو کچھ کیا تمہارے محفوظ مستقبل کے لئے کیا اور ٹھیک کیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر تم یا کوئی اور اعتراض کرے۔“

وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل کر گھر کے برآمدے میں آ گئی تھیں۔ سامنے صحن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مہندی کی رسم مشترکہ طور پر ایک ہی جگہ انجام دی جانی تھی، مہندی عارفین کے گھر کے بجائے تایا کے گھر سے صحن میں آنی تھی اور وہیں پر تمام رسومات سرانجام دی جانی تھیں۔ اس کے بعد صبا کے گھر سے ان سب نے حیدر کی مہندی لے کر تایا کے گھر جانا تھا، سارا انتظام صحن میں کیا گیا تھا اور اسے خوب سجایا گیا

تھا ہمیشہ شادی کی تقریبات کے لئے صحن کو ہی استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ وہ بڑا تھا اور اس میں بہت زیادہ مہمان بٹھائے جا سکتے تھے، ایک تھکاوٹ سی ان کے وجود پر چھائی جا رہی تھی، وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

”کیا بات ہے اقصیٰ! تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ تیار کیوں نہیں ہو رہیں؟“ عظیم نے اندر سے باہر آتے ہوئے ان سے پوچھا تھا۔

”عظیم میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ پتا نہیں ہم یہ سب ٹھیک کر رہے ہیں یا نہیں پتا نہیں ہمیں سارہ کا رشتہ حیدر کے ساتھ کرنا چاہئے تھا یا نہیں؟“ وہ بے حد بے چین تھیں۔

”اقصیٰ! اب ایسی باتیں سوچنے کا وقت ہے نہ موقع، سارہ کا نکاح ہو چکا ہے۔ کچھ دیر بعد مہندی کی رسم ادا کی جائے گی اور کل شام اس کی رخصتی ہے پھر اب ایسی باتوں پر ملال کا فائدہ۔“ انہوں نے نرمی سے بہن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا تھا۔

”ہاں، بس ملال ہی تو نہیں جاتا۔ ملال ہی تو نہیں جاتا۔“ اقصیٰ کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

”تم پریشان مت ہو۔ حیدر اچھا لڑکا ہے۔ سارہ کا خیال رکھے گا پھر سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔“

”صرف اسی ایک وجہ سے، صرف اسی ایک وجہ سے میں نے یہ رشتہ قبول کر لیا تھا، ورنہ عظیم، میں کبھی سارہ کو اس ذلیل خاندان میں جانے نہ دیتی۔ یہ لوگ اس قابل نہیں ہے کہ صبا کی بیٹی ان کے پاس جائے۔“

اقصیٰ خود پر ضبط نہیں کر سکی تھیں اور رونے لگی تھیں، عظیم کچھ افسردگی سے خود بھی اقصیٰ کے پاس بیٹھ گئے۔

"اقصیٰ! جو کچھ ہو چکا، اسے بھولنے کی کوشش کرو۔" انہوں نے بہن کا ہاتھ تھام کر اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔

"میں کیا کروں عظیم! مجھے کچھ بھولتا نہیں مجھے۔ کچھ بھولتا ہی تو نہیں۔ مجھے آج بھی ایک ایک بات یاد ہے۔ ایک ایک منظر نقش ہے میرے دل پر، یہی گھر تھا۔ یہی لوگ تھے۔ اسی طرح سب کچھ سجا ہوا تھا۔ اسی طرح سب لوگ ہنس بول رہے تھے جب تائی امی نے نیچے آ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں بھی امی کے ساتھ حواس باختہ اوپر گئی تھی اور وہاں تائی نے اسے عادل کے ساتھ کمرے سے نکالا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا، میری بہن نے کچھ نہیں کیا مگر وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آیا ہو گا کہ تائی اس کی ساس اس کے ساتھ یہ دھوکا کر سکتی ہیں۔ آج عارفین کی بڑی بہن کو ایک معمولی گھر حق مہر میں لکھواتے ہوئے اتنا اعتراض ہوا کہ وہ یہ بات بتانے کے لئے سارہ کے پاس جا پہنچی اور اس شام وہی دوپٹے کے بغیر صبا کو دھکے دیتے ہوئے نیچے لائی اور اسے ننگے سر اور ننگے پاؤں صحن میں دھکیل دیا تھا۔ میں یہیں بیٹھی ہوئی تھی جہاں آج بیٹھی ہوں اور مجھے لگ رہا تھا۔ کوئی میرے وجود کو چھری سے کاٹ رہا ہے۔ تم بھی تو کھڑے تھے نا یہیں پاس ہی تو کھڑے تھے جب تایا نے اسے صحن کے بیچوں بیچ جوتوں سے مارنا شروع کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا۔ امی، ابو نے اسے کبھی سخت ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اور اس شخص نے سب کے سامنے اس کے سر پر جوتے مارے تھے اور میں عظیم! میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں بس یہیں بیٹھی روتی چیختی رہی تھی اور سب لوگ برآمدوں میں تماشا دیکھتے رہے تھے۔ کسی نے آگے بڑھ کر تایا کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی، تمہیں یاد ہے۔ وہ ایک بار بھی نہیں چیخی تھی۔ اس نے کتنی خاموشی کے ساتھ سر جھکا کر مار کھائی تھی۔ اس کے ساتھ کسی نے اچھا سلوک نہیں کیا نہ ہم نے نہ کسی اور نے تم اسے جان

سے مار ڈالنا چاہتے تھے جب تائی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم کھائی تھی کہ اسے اور عادل کو انہوں نے عارفین کے کمرے میں نہیں بھیجا تھا اور صبا نے قرآن پر ہاتھ رکھنے سے انکار کر دیا تھا، پھر عارفین نے اسی کمرے میں اسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی تھی تب میرا دل چاہا تھا میں صبا کو مار دوں۔ مجھے بھی باقی سب کی طرح یقین آ گیا تھا کہ وہی مجرم ہے مگر وہ مجرم نہیں تھی۔ مجرم تو ہم تھے گناہ تو ہم سے ہوئے تھے اور یہ خاندان تو سات پشتوں تک صبا کا مقروض رہے گا کس کس چیز کا قرض اتاریں گے۔ یہ تایا کو خود مختاری کی بیماری تھی۔ فیصلوں کا شوق تھا۔ بڑا زعم تھا اپنی خاندانی نجابت پر۔ وہ کس کس گناہ کا کفارہ ادا کریں گے۔ صبا کو ایک بوڑھے کی دوسری بیوی بنا دینے کا؟ یا سارہ پر ناجائز اولاد کا ٹھپہ لگوا دینے کا؟ یا شادی کے چار ماہ بعد اسے طلاق ہو جانے کا؟ اس خاندان کی جھولی گناہوں سے بھری ہوئی ہے اور ہم...... ہم ایک بار پھر ان سے رشتے استوار کر رہے ہیں۔ سارہ کو اس گندگی میں پھینک رہے ہیں۔ یہ لوگ کیا اس قابل ہیں کہ انہیں معاف کیا جائے۔ ان کی وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی وجہ سے ہمیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑا اور یہ سب دیکھو، یہ سب کتنے خوش، کتنے مطمئن ہیں۔ انہیں احساس ہی نہیں ہے کہ انہوں نے کتنی زندگیاں برباد کر دی ہیں۔ یہ تو اس شادی کے ذریعے اپنے کفارے ادا کر رہے ہیں۔ اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں ورنہ انہیں سارہ کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔"

وہ سسکتی رہی تھیں۔ عظیم دل گرفتگی کے عالم میں سر جھکائے خاموشی سے ان کے پاس بیٹھے رہے۔

"کچھ بھی ہو اقصیٰ! سارہ کے ساتھ وہ سب نہیں ہو سکتا جو صبا کے ساتھ ہوا۔ اس وقت ہم بے بس تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صبا کو بچا سکتے تھے نہ اسے تحفظ دے سکتے تھے۔ اب حالات ویسے نہیں ہیں۔ اب ہم سارہ کو سپورٹ کر سکتے ہیں پھر عارفین اور

حیدر دونوں سارہ کا خیال رکھیں گے۔ تم پریشان مت ہو اقصیٰ۔"

عظیم نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی تھی وہ بھائی کے کندھے سے لگ کر رونے لگیں۔ صحن میں چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ مہندی لے جانے کے لئے سب لوگ تایا کے گھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ اقصیٰ کی بڑی بیٹی باہر آ گئی تھی۔

"افوہ امی! آپ اب تو آکر تیار ہو جائیں۔ وہ لوگ آنے والے ہیں، جلدی کریں۔ اب یہ رونا دھونا ختم کریں۔"

وہ آکر ماں کا بازو کھینچنے لگی تھی۔ اقصیٰ آنکھیں پونچھتے ہوئے تیار ہونے کے لئے اندر آ گئی تھیں۔ رات دیر گئے مہندی کا ہنگامہ جاری رہا تھا۔

❁

"بس مجھے یہاں اتار دیں میں تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔" سارہ نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" اقصیٰ نے بھی گاڑی سے اترنا چاہا تھا لیکن سارہ نے انہیں روک دیا۔

"نہیں خالہ! مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔ آپ کے ساتھ جانا مجھے اچھا نہیں لگے گا، میں بس اپنی دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گی۔"

اس نے گاڑی سے اتر کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ اقصیٰ نے بادل نخواستہ اسے جانے دیا۔ وہ اسے تیار کروانے کے لئے بیوٹی پارلر لے کر جا رہی تھیں، جب اس نے اپنی کسی دوست سے ملنے کی فرمائش کی تھی اور ڈرائیور کو پتا بتایا تھا۔ اقصیٰ نے بڑے آرام سے ڈرائیور کو وہاں جانے کا کہہ دیا تھا کیونکہ بارات کو شام پانچ بجے آنا تھا اور اس وقت صرف ایک بجا تھا۔ گاڑی میں اقصیٰ کے ساتھ ان کی بڑی بیٹی افشاں اور عظیم کی بیوی بھی تھی۔ قائد اعظم روڈ پر ایک بلند و بالا کمرشل عمارت کے سامنے اس نے گاڑی

رکوائی تھی۔

"یہیں اوپر اس کا فلیٹ ہے۔"

سارہ نے اقصیٰ کو بتایا تھا۔ پھر وہ گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھی۔ ڈرائیور نے کار پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی اور وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگیں۔ انہیں وہاں بیٹھے پندرہ منٹ گزر گئے لیکن وہ باہر نہیں آئی۔ اقصیٰ نے گھڑی دیکھنا شروع کر دیا تھا پھر آدھ گھنٹہ گزر گیا لیکن وہ باہر نہیں آئی اب اقصیٰ کو بے چینی ہونے لگی تھی۔ بیوٹیشن کے ساتھ ان کی دو بجے کی اپائنٹمنٹ تھی اور ڈیڑھ یہیں بج چکا تھا۔

"تم لوگ بیٹھو، میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔" اقصیٰ نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا تھا۔

"امی! اب کہیں یہ نہیں ہو کہ آپ سارہ کو ڈھونڈنے جائیں اور وہ اتنی دیر میں آ جائیں پھر ہم آپ کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔" افشاں نے ماں سے کہا تھا۔

"نہیں اگر سارہ آ جاتی ہے تو تم لوگ بیوٹی پارلر چلے جانا میں ٹیکسی لے کر آ جاؤں گی۔"

اقصیٰ یہ کہہ کر گاڑی سے اتر گئی تھیں۔ یہ ایک کمرشل عمارت تھی اور کافی لوگ اندر آ جا رہے تھے۔

"فلیٹس کس منزل پر ہیں؟" اقصیٰ نے چوکیدار سے پوچھا تھا۔

"بی بی! اس عمارت میں کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ بس آفس ہیں۔"

اقصیٰ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی انہوں نے حواس بحال رکھتے ہوئے ایک بار پھر اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ آفس تو گراؤنڈ فلور پر ہوں گے۔ اوپر والی منزلوں پر فلیٹ ہوں گے؟"

"بی بی! یہ عمارت میرے سامنے بنی تھی۔ میں پندرہ سال سے یہاں ہوں، یہاں

ساری منزلوں پر ہی آفس ہیں، فلیٹ کوئی نہیں۔ اوپر والی دو منزلیں تو اس کمپنی نے لے رکھی ہیں۔" اس نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا نام بتایا تھا۔

"نیچے کی دو منزلوں پر بھی صرف آفس ہیں پھر بھی اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ اندر جا کر پتا کر لو۔" اقصیٰ کو لگا تھا جیسے ان کے سر پر آسمان گر پڑا ہو۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی واپس کار پارکنگ میں آئی تھیں۔

"چوکیدار کہہ رہا ہے کہ اس عمارت میں کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ صرف آفس ہیں۔" انہوں نے بوکھلائے ہوئے افشاں اور مریم کو بتایا تھا۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر آئی تھیں۔

"آئیں ہم خود چل کر دیکھتے ہیں۔"

عظیم کی بیوی بھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ تینوں عمارت کے اندر گئی تھیں اور وہاں انہوں نے جس سے بھی پوچھا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ وہاں کوئی فلیٹ نہیں ہے صرف آفس ہیں۔ وہ تینوں بے حد پریشان ہو کر عمارت کے اندرونی دروازے پر بیٹھے گارڈ کے پاس گئی تھیں اور اسے انہوں نے سارہ کا حلیہ بتا کر اس کے بارے میں معلومات لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھی سارہ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا تھا۔

"آپ خود دیکھ لیں، اس عمارت میں اتنی عورتیں آتی ہیں۔ ہم کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔"

گارڈ نے ان سے کہا تھا۔ اب ان تینوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

"امی! آپ پاپا اور انکل عظیم کو رنگ کریں وہی کچھ کر سکتے ہیں۔"

افشاں نے ماں کو سمجھایا تھا، ایک پبلک کال آفس سے فون کر کے انہوں نے عظیم کو بلایا تھا اور وہ آدھ گھنٹہ بعد حواس باختہ سے وہاں پہنچے تھے۔ انہوں نے بھی چوکیدار اور گارڈ سے سارہ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرنا چاہی تھی مگر وہ بھی ناکام

رہے تھے، سارہ کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

"یہ شادی اس کی پسند سے ہو رہی ہے پھر وہ کہاں غائب ہو سکتی ہے۔" عظیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"تم اسے یہاں لے کر کیوں آئی تھیں۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ اسے اکیلے اندر جانے دو۔"

وہ بری طرح اقصیٰ پر برس پڑے تھے اقصیٰ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ عظیم نے موبائل پر کال کر کے اقصیٰ کے شوہر اسد کو بھی وہیں بلوا لیا تھا۔ ان تینوں کو انتظار کرنے کا کہہ کر وہ دونوں ایک بار پھر اندر غائب ہو گئے تھے، ایک گھنٹے بعد ستے ہوئے چہروں کے ساتھ ان کی واپسی ہوئی تھی۔

"اب اور کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ عارفین کو یہاں بلا لیا جائے۔ اب تک تو بارات بھی روانہ ہو چکی ہو گی۔ تم لوگ ہوٹل چلے جاؤ کیونکہ وہاں بارات کے استقبال کے لئے تو گھر والوں میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔ اقصیٰ! تم یہیں رہو اور مریم! تم عارفین کو یہاں بھجوا دو اسے ابھی سارہ کی گمشدگی کے بارے میں مت بتانا۔ صرف یہ کہنا کہ عظیم نے کسی ضروری کام کے لئے یہاں بلا لیا ہے اور کسی سے بھی ابھی سارہ کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ بس یہی کہنا کہ وہ ابھی بیوٹی پارلر میں ہے اور اقصیٰ اس کے پاس ہے۔" عظیم نے انہیں ہدایات دی تھیں اور پھر انہیں بھجوا دیا تھا۔

آدھ گھنٹہ بعد عارفین آئے تھے اور وہ کافی پریشان نظر آ رہے تھے شاید وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ انہیں وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ عظیم نے انہیں پورا واقعہ بتا دیا تھا اور ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سارہ کہاں جا سکتی ہے۔ اقصیٰ! کہیں تم نے تو اسے کچھ نہیں بتایا۔" عارفین کا ذہن فوراً اقصیٰ کی طرف گیا تھا۔

"نہیں عارفین! یقین کرو میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ یوں اچانک کیوں غائب ہوگئی ہے۔" اقصیٰ نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

"خدا کے لئے اقصیٰ! اگر یہ سب تم نے کیا ہے تو ایسامت کرو، وہاں پورا خاندان اکٹھا ہے۔ میرے سب دوست احباب، ملنے والے جمع ہیں۔ میں ان کا سامنا کیسے کروں گا۔" عارفین عباس نے منت آمیز انداز میں اقصیٰ سے کہا تھا۔

"عارفین! میرا یقین کرو۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ سارہ کو میں نے نہیں بھیجا۔ اپنی مرضی سے گئی ہے، غلط بیانی کر کے گئی ہے کہ یہاں اسکی دوست کا فلیٹ ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس کے چلے جانے سے صرف تمہاری رسوائی ہے؟ نہیں عارفین ہم بھی کسی کا سامنا نہیں کر سکیں گے۔" اقصیٰ بے اختیار رو پڑی تھیں۔

عارفین انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ کچھ دیر تک انہوں نے بھی ایک موہوم سی امید میں اس عمارت میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی اور پھر بالآخر انہوں نے اپنے ایک دوست کو فون کر کے پولیس کو بلوالیا تھا، پولیس کی تھوڑی سی تفتیش سے ہی یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ سامنے والے گیٹ سے داخل ہونے کے بعد عقبی گیٹ سے باہر نکل گئی تھی۔ انہیں یہ اندازہ پہلے بھی تھا کہ وہ اپنی مرضی سے غائب ہوئی تھی مگر اب یہ بات طے ہوگئی تھی کہ وہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر وہاں آئی تھی۔ یقیناً وہ پہلے بھی اس عمارت میں آتی جاتی رہی تھی اور جانتی تھی کہ اس عمارت کا ایک عقبی گیٹ بھی ہے اور وہ وہاں سے آسانی سے جاسکتی ہے۔

شام ہو چکی تھی اور وہ وہاں سے واپس آگئے تھے۔ عارفین نے ہوٹل واپس آکر حیدر کو ایک کمرے میں بلایا تھا اور اسے سب کچھ بتادیا تھا وہ سکتے میں آگیا تھا۔

"پاپا! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا "وہ کہاں

جاسکتی ہے اور کیوں جائے گی؟" وہ روہانسا ہوگیا تھا "مجھے بتائیں، میں کیا کروں میں لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں؟"

"حیدر! خود پر قابو پاؤ، اقصیٰ سب سے کہہ رہی ہے کہ سارہ کو فوڈ پوائزننگ ہوگئی ہے اور اس وجہ سے اسے ہاسپٹل ایڈمٹ کروانا پڑتا ہے، ہم بھی سب سے یہی کہیں گے۔"

"پاپا! لوگ بے وقوف نہیں ہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے، وہ اس بات پر یقین کرلیں گے۔ میں ان کے سوالوں کا جواب کیسے دوں گا۔ مجھے سچ بتائیں۔ وہ کیوں گئی ہے؟ ایسا کیا ہوا ہے؟" حیدر کو لگ رہا تھا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوجائے گا۔ "میں اب کسی کے سامنے نہیں جاؤں گا میں اس کمرے سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اس سے میری شادی آپ کا فیصلہ تھا۔ آپ جائیں، لوگوں سے جو بھی کہنا ہے آپ کہیں۔ میں کسی کا سامنا نہیں کروں گا۔"

حیدر نے اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔ عارفین کچھ کہے بغیر باہر چلے گئے۔

❁

"پاپا! آپ کو جو کچھ مجھ سے چھپانا تھا۔ آپ نے چھپالیا۔ اب مجھ سے صرف سچ بولیں۔ مجھے بتائیں۔ صبا سے آپ کا کیا رشتہ تھا۔ آپ دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا۔ سارہ کس وجہ سے چلی گئی؟"

اس رات سارے مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد وہ دونوں گھر آئے تھے اور حیدر گھر آتے ہی سارہ کے کمرے میں چلا گیا تھا، سارہ اپنی چیزیں صبا کے گھر لے کر گئی تھی، اس کا باقی سامان یہیں پر تھا اور اس کی چیزیں دیکھتے ہوئے حیدر کو جھٹکے پر جھٹکے پہنچ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ عارفین کے صبا کے نام لکھے ہوئے خطوط اور کارڈز لگے تھے اور ان کی وہاں موجودگی نے اسے جتنا حیران کیا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر اس انکشاف نے اسے دم بخود کیا تھا کہ صبا عارفین کی منکوحہ رہ چکی تھیں۔ پھر اس کے ہاتھ سارہ کی

تعلیمی اسناد گی تھی اور وہ یہ جان کر ساکت ہو گیا تھا کہ وہ گریجویشن تک فرنچ کو ایک سپشنل سبجیکٹ کے طور پر پڑھتی رہی ہے۔ پھر وہ باپ کے پاس آیا تھا اور اب وہ ان سے سوال کر رہا تھا۔ اس نے وہ کارڈز اور خطوط ان کے سامنے ٹیبل پر پھینک دیئے تھے۔ عارفین انہیں دیکھ کر ساکت رہ گئے تھے۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملے؟"

"سارہ کے کمرے سے، اسے یہ کہاں سے ملے؟ یہ آپ کو پتا ہوگا اور یہ جان کر آپ کو مزید صدمہ ہوگا کہ وہ کالج میں فرنچ پڑھتی رہی ہے اب آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ مجھے بتائیں وہ سب کچھ جو آپ نے نہیں بتایا اور جس کی سزا مجھے ملی ہے۔"

عارفین نے اپنا سر جھکا دیا تھا۔

آمنہ! اب اٹھ جاؤ یار! کتنی دیر سوتی رہو گی!" گل کی آواز نے اسے بیدار کر دیا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

گل آئینہ ہاتھ میں لئے تیزی سے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی، وہ بے خیالی میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ روز اس وقت اسی طرح بج دھج کر باہر جاتی تھی، اس کے بقول وہ اپنے منگیتر کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی تھی مگر اس کا منگیتر ہر تیسرے چوتھے دن بدل جاتا تھا سارہ کو اس کے منگیتر پر اعتراض تھا نہ منگیتر کے بدلنے پر۔

"بس میں اب جا رہی ہوں۔ تم دروازہ بند کر لینا، ہاں اور عذرا آج دیر سے آئے گی۔ وہ مجھے صبح بتا کر گئی تھی۔"

گل نے باہر نکلتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

روزہ افطار ہونے میں ابھی تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ وہ کچن میں آ گئی۔ وہاں کچھ بھی پکا ہوا نہیں تھا۔ پچھلی رات کے پکائے ہوئے کچھ دال چاول ابھی بھی پڑے ہوئے

تھے۔ وہ جانتی تھی کہ عذرا اور گل دونوں باہر سے کھانا کھا کر آئیں گی اور شاید اپنے لئے کچھ ساتھ لے بھی آئیں۔ چاولوں کو گرم کرنے کے بعد ایک گلاس میں پانی اور چاول لے کر وہ کمرے میں آ گئی دونوں چیزوں کو اس نے فرش پر رکھ دیا تھا اور خود دوبارہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی تھی۔

وہ روزہ سہ پہر کو سوتی نہیں تھی مگر آج خاص بات تھی۔ آج ایک بار پھر وہ اس کے ہاتھے چڑھتے چڑھتے بچی تھی۔ ڈیڑھ ماہ میں یہ تیسرا موقع تھا جب سارہ کا اس سے سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

پہلی دفعہ اس کا حیدر سے ٹکراؤ تب ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جب کچھ دن اپنی دوست کے پاس رہنے کے بعد اس نے اس کے ذریعے ایک ہاسٹل میں کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ اسے ہاسٹل میں آئے تیسرا دن تھا جب وہ کسی کام سے باہر گئی تھی اور واپسی پر اس نے بہت دور سے ہی اس کی سلور گرے سوک ہاسٹل کے باہر دیکھ لی تھی وہ بہت محتاط ہو کر کچھ اور آگے گئی تھی۔ نمبر پلیٹ کو وہ پہچان گئی تھی۔ کار میں کوئی نہیں تھا۔ یقیناً وہ ہاسٹل کے اندر ہوگا۔ کار سے کچھ آگے پولیس کی ایک وین بھی کھڑی تھی۔ وہ الٹے قدموں اپنی دوست کے پاس گئی تھی۔

"سارہ! تم نے مجھے دھوکا دیا تمہارے انکل اور خالہ تمہاری شادی کسی بوڑھے کے ساتھ نہیں کر رہے۔ میں حیدر سے مل چکی ہوں اس نے مجھے نکاح نامہ بھی دکھایا ہے اور تمہارے کارنامے کے بارے میں بھی بتایا ہے پھر اس کے بعد میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس کو تمہارا اتہ پتا بتا دیتی۔"

اس کی دوست عامرہ نے اس کے شکوے پر کہا تھا، وہ فیکٹری میں اس کے ساتھ کام کرتی تھی اور سارہ شادی والے دن سیدھی اس کے پاس گئی تھی۔ سارہ کے پاس اب کہنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اس کے پاس سے چلی آئی۔

پھر وہ دوبارہ ہاسٹل نہیں گئی تھی۔ اس کا بیگ اس کے پاس تھا جس میں اس کی ساری رقم موجود تھی، ہاسٹل میں پڑے ہوئے تھوڑے سے سامان کی اسے پرواہ نہیں تھی۔ اس نے کسی دوسرے ہاسٹل میں کمرہ ڈھونڈنے کے بجائے ایک پراپرٹی ڈیلر کے ذریعے ایک گندے سے گنجان آباد علاقے میں ایک فلیٹ چھ سو روپے ماہانہ پر کرائے پر لے لیا تھا، فلیٹ میں پہلے بھی دو لڑکیاں رہتی تھیں اور فلیٹ صرف ایک کمرے چھوٹے سے کچن اور اسی سائز کے باتھ روم پر مشتمل تھا اور اس کی حالت خاصی خراب تھی مگر سارہ کو اس کی پروا نہیں تھی، اس کے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ اپنے سر پر چھت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

دوسری بار حیدر سے تب اس کا سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا تھا جب اس نے کام کی تلاش شروع کی تھی، اس کے پاس اس کی تعلیمی اسناد اور سرٹیفکیٹ نہیں تھے اور ان کے بغیر وہ کوئی ڈھنگ کی جاب حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ تب ہی اسے خیال آیا تھا کہ جس اکیڈمی کے ذریعے اس نے پہلے ٹیوشنز حاصل کی تھیں وہاں اس نے اپنی اسناد کی فوٹو کاپیز جمع کروائی تھیں اور وہ اس اکیڈمی کے ذریعے ایک بار پھر ٹیوشن حاصل کر سکتی تھی۔

وہ ایک روز وہاں گئی تھی۔ اکیڈمی کے مالک کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے اس سے بیٹھنے کو کہا تھا اور پھر کسی ضروری کام سے اندر چلا گیا تھا کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ کسی بچے کے والد تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں اور ان کے بچے کو ٹیوشن کی ضرورت ہے اس لئے سارہ وہاں بیٹھ کر کچھ انتظار کرے وہ بس آدھ گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے اس نے دس منٹ وہاں بیٹھ کر انتظار کیا تھا اور پھر یکدم اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے خبردار کرنے لگی تھی اس نے اس اکیڈمی کے مالک سے پانی مانگا تھا وہ پانی لینے اندر گئے تھے اور وہ بیرونی دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔

تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس نے سڑک پار کر لی تھی اور پھر جیسے ہی اس نے

موڑ کاٹا تھا۔ سلور گرے رنگ کی وہی جانی پہچانی کار اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔

"اگر چند منٹ اور میں وہاں ٹھہرتی تو یہ شخص میرے سامنے ہوتا۔" اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ صرف اس اکیڈمی نہیں گئی بلکہ کسی اکیڈمی بھی نہیں گئی۔ اس نے اپنی تعلیمی اسناد دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ صرف ان ہی کے ذریعے وہ کسی فیکٹری میں کوئی معقول جاب حاصل کر سکتی تھی۔ کل وہ اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ دوبارہ بنوانے کے لئے اسکول گئی تھی اور کلرک نے اسے دوسرے دن آنے کے لئے کہا تھا اور آج جب وہ اپنے اسکول گئی تھی تو اسکول کے گیٹ سے تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر کھڑی اسی خالی کار نے ایک بار پھر اسے دہلا دیا تھا۔

"اے خدا! یہ شخص کیوں سانپ کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

اس نے بے اختیار سوچا تھا اور گم صم سی وہاں سے واپس آ گئی اس نے رستے میں ہی اپنی تعلیمی اسناد کے حصول کا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا اور پورا رستہ وہ سوچتی رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گھر آ کر وہ بستر میں گھس کر سو گئی تھی اور اٹھنے کے بعد بھی وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس رات اس نے سب کچھ سنا تھا۔ اقصیٰ یہ بھول گئی تھیں کہ سارہ صبا کے کمرے میں ہے اور صبا کے کمرے کی کھڑکی اسی برآمدے میں کھلتی تھی جہاں وہ بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس نے مایوں کے کپڑے پہننے کے لئے سب کو کمرے سے نکال کر دروازہ بند کیا تھا اور تب ہی اس نے اقصیٰ اور عظیم کی باتوں کی آواز سنی تھی وہ کھڑکی کے پاس آ گئی تھی اور پھر ہر راز کھلتا گیا تھا۔ اس کی ماں نے کیا کیا تھا، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اس نے کیوں اس طرح اپنی زندگی برباد کر دی تھی۔ کچھ بھی اس کے لئے راز نہیں رہا تھا۔

وہ ایک مجسمہ کی طرح ساکت کھڑی رہ گئی تھی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

وہ کیا کرے۔ روئے، چیخے، چلائے، وہاں سے بھاگ جائے کیا کرے، پھر اس کی کزنز نے دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا اور وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ پھر مہندی کی رسم کے لئے اسے باہر صحن میں لے جا کر پھولوں سے سجی ہوئی چوکی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ پھر باری باری خاندان کی مختلف عورتوں نے اس کے سر میں تیل لگانا اور اس کے ہاتھ پر مہندی رکھنا شروع کر دیا۔

اس نے یک دم رونا شروع کر دیا تھا۔ ہر بار جب کسی کا ہاتھ اس کے سر پر تیل لگاتا اسے لگتا جیسے کسی نے اسے جوتا مارا ہو، اسی طرح صحن کے بیچوں بیچ جس طرح چوبیس سال پہلے اس کی ماں کو مارے گئے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اسی طرح رو رہی ہے جیسے سب لڑکیاں شادی پر روتی ہیں۔ اسے ان سب کے چہرے بھیانک اور کریہہ لگ رہے تھے۔ چند گھنٹے پہلے تک وہ اسے عظیم لگ رہے تھے جنہوں نے سب کچھ بھول کر اسے اپنایا تھا اور اب وہ ان سب سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی، اسی طرح جیسے اس کی ماں بھاگ گئی تھی، اس کی گود نوٹوں سے بھرتی جا رہی تھی اور اسے اپنا وجود کسی مزار پر رکھے ہوئے اس ہدیے کے ڈبے کی طرح لگ رہا تھا جس میں لوگ خود کو بخشوانے کسی منت کے پورا ہونے یا اپنی زندگی میں کامیابی کے لئے کچھ نہ کچھ ڈال کر جاتے ہیں۔ ہاں وہ سب بھی یہی کر رہے تھے صبا سے کی جانے والی زیادتی کے کفارے کے لئے اس کی بیٹی پر روپے نچھاور کر رہے تھے۔ وہ روتے روتے چپ ہو گئی تھی۔ ایک آگ نے اس کے وجود کو جلانا شروع کر دیا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا اس نے سوچ لیا اور پھر اس نے وہی کیا تھا جو اس نے سوچا تھا۔ وہ اس عمارت میں گئی تھی اور پھر اس کے پچھلے گیٹ سے نکل کر سیدھی اپنی دوست کے پاس فیکٹری میں گئی تھی۔ وہاں اس نے رو رو کر اسے بتایا تھا کہ کس طرح خالہ اور انکل ایک بوڑھے شخص کے ساتھ زبردستی اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور وہ گھر سے

بھاگ آئی ہے۔ عامرہ اور اس کے گھر والے بھی اسی عمارت میں رہتے تھے جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

انہوں نے اسے گھر میں پناہ دے دی تھی۔ دوسرے دن اس عمارت میں پولیس آئی تھی اور اس نے سارہ کے بارے میں سب سے پوچھ گچھ کی تھی۔ سارہ کا پرانا فلیٹ اب کسی اور رہائشی کے پاس تھا اور پولیس صرف اس عمارت میں ہی نہیں گئی تھی بلکہ اس فیکٹری میں بھی پہنچ گئی تھی جہاں وہ کام کرتی رہی تھی۔

عامرہ کے گھر والوں نے اس کے بارے میں ڈر کے مارے پاس پڑوس میں بھی کسی کو نہیں بتایا تھا۔ تیسرے دن عامرہ اخبار لے آئی تھی جس میں اس کی گمشدگی کی خبر کے ساتھ اس کی مایوں پر کھینچی جانے والی ایک تصویر اور ایک بڑے انعام کی آفر تھی۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کی تصویر ایک ہفتہ تک روزانہ اخبار میں شائع ہوتی رہی تھی اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے ڈھونڈنے کے لئے کتنی سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے۔

سارہ جانتی تھی کہ عامرہ بہت دیر تک اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے پاس وہ ساری رقم موجود تھی جو مہندی پر اسے دی گئی تھی اور اسی لئے اس نے عامرہ سے اپنے لئے کسی اور جگہ کا بندوبست کرنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ لوگ کہیں اسے ڈھونڈتے ہوئے عامرہ کے گھر تک نہ پہنچ جائیں اور بعد میں اس کا خدشہ سچ ثابت ہوا تھا۔

اخبار میں شائع ہونے والی تصویر میں اس کا چہرہ میک اپ سے بالکل عاری تھا اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا تھا۔ گل اور عذرا کو اس نے اپنا نام آمنہ بتایا تھا۔ گل اور عذرا کون تھیں وہاں کیوں رہتی تھیں۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا نہ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی، اسے صرف یہ پتا تھا کہ وہ دونوں کسی فیکٹری میں کام کرتی ہیں۔ کیا کرتی ہیں وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

ان دونوں نے سارہ سے اس کا حدود اربعہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ خاص طور پر اس کے کلائیوں تک مہندی سے بھرے ہاتھوں نے انہیں کئی قسم کے شبہات میں ڈالا تھا اور ہر بار جب وہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتیں تو وہ رونا شروع کر دیتی۔ تنگ آکر انہوں نے اس سے کچھ پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔

کئی دنوں تک ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ سارہ کو خود پتا نہیں چلتا تھا، کس بات پر اس کا دل بھر آتا اور وہ رونا شروع کر دیتی پھر کئی کئی گھنٹے وہ روتی رہتی عزت اور خودداری کی خاطر آسائشوں کو ٹھوکر مارنا کتنا مشکل کام تھا۔ یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔ وہ صرف چار ماہ آسائش میں رہی تھی اور اس کے لئے اب پہلے کی طرح ٹھوکریں کھاتے ہوئے زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔

"امی تو پیدائش سے جوانی تک آسائشوں میں رہی تھیں پھر انہوں نے کیسے سب کچھ چھوڑ دیا؟" وہ سوچتی اور آنسو بڑھتے جاتے۔

گل نے ایک دن اس سے پوچھا تھا۔ "تم اتنی خاموش کیوں رہتی ہو۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی، اسے یاد آیا تھا اس نے بھی کئی دفعہ امی سے یہی سوال کیا تھا۔ وہ ہر بار خاموشی سے اسے دیکھتی رہتی تھیں۔ جواب نہیں دیتی تھیں۔ لوگ خاموش کیوں ہو جاتے ہیں اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ کیوں دل چاہتا ہے کہ اپنوں کی نظروں سے اپنے وجود کو چھپا لیا جائے۔ دوبارہ ان کے سامنے نہ آیا جائے نہ ان سے کبھی بات کی جائے یہ بھی اس کی نظر میں راز نہیں رہا تھا۔

چار سال اس نے صرف ماں کے معمے کو حل کرنے کے لئے فرنچ پڑھی تھی مگر وہ انہیں سمجھنے، انہیں سمجھنے میں ناکام رہی تھی۔ کتابیں پڑھنے اور زبانیں سیکھنے سے لوگوں کے اسرار سمجھ میں نہیں آتے اور اب اسے ماں کی طرح رہتے ڈیڑھ ماہ ہوا تھا اور وہ ان کی ذات کے ہر راز کو جاننے لگی تھی۔

سائرن ہونے لگا تھا۔ اس نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک فیکٹری میں چھوٹے بچوں کے فراک سینے کا کام شروع کر دیا تھا۔

"تمہارے ہاتھ میں زیادہ صفائی نہیں ہے۔ ابھی کافی عرصہ تمہیں کام سیکھنا پڑے گا۔ اس لئے تمہیں باقی عورتوں جتنے روپے نہیں ملیں گے بلکہ سیکھنے والی لڑکیوں کی طرح اجرت ملا کرے گی۔"

پہلے دن ہی سپروائزر عورت نے اس کا کام دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس کے کام میں صفائی نہیں ہے۔ وہ سلائی کڑھائی میں کبھی بھی ماہر نہیں رہی تھی۔ بس اسے بہت سے دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی آتا تھا، اس نے اس فیکٹری میں کام ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد شروع کیا تھا اور وہ ملنے والے معاوضے سے خوش نہیں تھی لیکن اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس روپے کم ہوتے جا رہے تھے اور ہر ماہ فلیٹ کا کرایہ، بجلی اور گیس کے بل اور دوسرے اخراجات کے لئے اسے روپیہ چاہئے تھا۔ یہاں کام کرنے سے بہت زیادہ نہیں لیکن وہ اتنے پیسے ضرور کما سکتی تھی جس سے اس کے بنیادی اخراجات پورے ہو جاتے۔

دو دن پہلے عذرا نے اطلاع دی تھی کہ وہ چند دن تک فلیٹ چھوڑنے والی ہے کیونکہ وہ شادی کر رہی تھی۔ اس کے لئے یہ ایک بری خبر تھی کیونکہ اس کے فلیٹ چھوڑنے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے اور گل کو فلیٹ کا زیادہ کرایہ دینا پڑتا اور بجلی اور گیس کے بل آپس میں بانٹنے پڑتے (پہلے وہ تین لوگ اس کو شیئر کرتے تھے) اس نے بجھے دل سے عذرا کو مبارکباد دی تھی اور بستر میں لیٹ کر ایک بار پھر حساب کتاب میں مصروف ہو گئی تھی۔

گل اور عذرا دونوں بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک ہی بستر میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور باتیں کرتے کرتے وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ وہ افسردگی سے ان کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہی تھی اور پھر انہیں سوچوں میں گم وہ سو گئی تھی۔

دوبارہ اس کی آنکھ سحری کے وقت کھلی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے حد تیز تھی، اسے یاد آ گیا تھا چند لمحے پہلے اس نے خواب میں کیا دیکھا تھا۔ اس نے حیدر کو دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ دونوں حیدر کے گھر کے لان میں پھر رہے ہیں ہنستے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے اور پھر یک دم اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کو گھور رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو جکڑ لیا، بہت دنوں سے یہی ہو رہا تھا۔ وہ اسے خواب میں اپنے ساتھ دیکھتی تھی۔ اسی طرح اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا ہوا، دھیمی آواز میں ہنستا ہوا اور پھر یک دم اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ اس نے بستر سے نکل کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ چند منٹوں بعد گل اور عذرا بھی اٹھ گئی تھیں۔ آج انتیس واں روزہ تھا اور وہ دونوں رات کو اسے بتا چکی تھیں کہ صبح وہ بھی روزہ رکھیں گی۔ پہلے روزے کی طرح انہوں نے بس آخری روزہ رکھنا ضروری سمجھا تھا۔

اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ کچن میں جا کر اس نے چائے بنائی تھی اور پھر تینوں کے لئے پراٹھے پکانے کے بعد اپنے حصے کی چائے کا کپ اور پراٹھا لے کر کمرے میں آ گئی۔ گل اور عذرا بھی چائے اور پراٹھا لے کر کمرے میں آ گئی تھیں۔

سارہ پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے لقمے بے دلی سے چائے کے ساتھ نگلتی جا رہی تھی۔ تب ہی گل نے کسی بات پر قہقہہ لگایا تھا، سارہ نہیں جانتی تھی اسے کیا ہوا، بس اس نے چائے اور پراٹھا ایک طرف رکھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر بے آواز رونا شروع کر دیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا بھئی؟ اب تم پر کون سی آفت ٹوٹی ہے؟" گل اور عذرا اس کے قریب چلی آئی تھیں مگر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"اس وقت کون یاد آ گیا ہے؟ کیا رونے کی بیماری لگا رکھی ہے۔ اب پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ سحری ختم ہونے میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے کم از کم اپنا کھانا تو کھا لو آمنہ! کیا پاگل ہو گئی ہو؟ اس وقت رونے کی کیا بات ہے؟ اپنا سر اٹھاؤ۔"

گل اور عذرا باری باری اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی تھیں مگر وہ چپ ہوئی تھی نہ اس نے سر اٹھایا تھا۔ تنگ آ کر گل اور عذرا نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ پھر اذان ہونے لگی تھی مگر وہ اسی طرح چہرہ چھپائے آنسو بہاتی رہی۔ وہ دونوں کمرے کی لائٹ بند کر کے ایک بار پھر بستر میں جا چکی تھیں۔

چھ بجے کے قریب اس نے اٹھ کر فیکٹری جانے کی تیاری شروع کر دی تھی، اس کی متورم آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے نے فیکٹری میں بھی سب کو متوجہ کیا تھا۔

"طبیعت خراب ہے۔" اس نے ہر ایک سے یہی کہا۔ تین بجے فیکٹری سے فارغ ہونے کے بعد وہ واپس گھر جانے کے بجائے بازار چلی گئی تھی۔ پورا ایک گھنٹہ وہ بغیر کسی مقصد کے بازار میں پھرتی رہی دکانوں پر بڑھتی ہوئی چہل پہل اور سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے چوڑیوں اور عید کارڈوں کے اسٹال دیکھتی رہی۔ پچھلے سال بھی وہ عید پر ماں کے ساتھ بے مقصد بازار میں پھرتی رہی تھی تب اس کی دوست عامرہ بھی اس کے ساتھ تھی اور اس نے کچھ چیزیں بھی خریدی تھیں۔ اس دفعہ وہ اکیلی ہی وہاں پھر رہی تھی۔

افطار میں ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ اس نے آج ملنے والی پوری اجرت ریڑھیوں سے کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں لگا دی۔ یہ عید کے لئے اس کی واحد عیاشی تھی۔

افطار میں آدھ گھنٹہ باقی تھا جب وہ واپس فلیٹ پہنچ گئی تھی گل نے دروازہ کھولا۔

"آؤ سارہ! آج تو بہت دیر لگا دی۔ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔"

سارہ نے غور نہیں کیا کہ اس نے اسے آمنہ کے بجائے سارہ کیوں کہا تھا۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے اندر آ گئی۔ لفافے اس نے دیوار کے پاس پڑی تپائی پر رکھ دیے۔ بیگ گدے پر پھینکنے کے بعد اس نے چادر اتاری اور تھکے تھکے انداز میں اسے تہہ کرنے لگی، گل اور عذرا خلاف معمول خاموش تھیں اس نے انہیں دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

"ہیلو کیسی ہو سارہ؟" مدھم لیکن بہت شستہ فرنچ میں اسے مخاطب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت ہو گئی۔ آواز اس کی سماعتوں کے لئے نا آشنا نہیں تھی۔ وہ اسے لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

کمرے میں Eternity کی پھیلی ہوئی مانوس سی مہک کو اس نے اب محسوس کر لیا تھا۔ سر اٹھا کر اسے کمرے میں ڈھونڈنے کی بجائے اس نے اسی طرح گردن کو حرکت دیے بغیر سر جھکائے ہوئے فرش پر نظریں دوڑانا شروع کر دیا تھا۔ کمرے کے دائیں کونے میں لیدر شوز پر اس کی نظر اٹک گئی تھی۔ وہ وہاں کھڑا تھا۔ سینے پر بازو لپیٹے، دیوار سے ٹیک لگائے۔ سیاہ جینز اور اسی کلر کی لیدر جیکٹ میں ملبوس پر سکون، سنجیدہ، نظر اس پر جمائے ہوئے۔ سارہ نے صرف ایک بار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور پھر سر جھکا لیا چادر کو ایک بار پھر کھول کر اس نے کندھوں پر ڈال لیا۔

"سارہ! یہ تم سے ملنا چاہتے تھے۔ کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں بتایا کہ تم آمنہ نہیں سارہ ہو اور یہ کہ تم ان کی منکوحہ ہو۔"

کمرے میں گل کی آواز گونجی۔ سارہ کا دل نہیں چاہا کہ وہ گل اور عذرا کی شکل دیکھے۔

"ہم ذرا ساتھ والے فلیٹ میں جا رہے ہیں۔ تمہیں ان سے جو بات کرنا ہے۔ کر لو۔" سارہ نے عذرا کو کہتے اور پھر دروازہ کرتے سنا تھا۔

"میں تمہیں صرف یہ سمجھانے آیا ہوں کہ فرار کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔"

کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔ سارہ نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ وہ اب پہلے والی جگہ سے آگے بڑھ آیا تھا۔

"مجھے کسی کی کوئی بات نہیں سننی ہے، تم یہاں سے جاؤ۔" اس کے چہرے کو دیکھے بغیر اس نے کہا تھا۔

"لیکن مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے اور میں یہاں سے جاؤں گا نہیں۔" وہ اب بھی پر سکون تھا۔

وہ چلا اٹھی "میں نے کہا، تم یہاں سے جاؤ۔"

"ہاں چلاؤ اور چلاؤ، اس سے تمہارا ڈپریشن دور ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں چیخنے چلانے سے انسان کا کتھارسس ہو جاتا ہے اور تمہیں اس وقت اسی ایک چیز کی ضرورت ہے۔" وہ کسی ماہر سائیکالوجسٹ کی طرح تشخیص کر رہا تھا۔ وہ یک دم چپ ہو گئی۔

"اور مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا بھی ہے۔" حیدر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے اپنے باپ سے پوچھو۔ میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"مجھے پاپا سے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ چکا ہوں، اب تمہاری باری ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے؟ میں نے تم پر کیا ظلم کیا تھا؟"

"میری ماں نے کسی پر کیا ظلم کیا تھا! تمہارے باپ نے ان سے کس چیز کا بدلہ لیا؟" وہ فرش پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔

"ہاں۔ تو یہ سوال تمہیں پاپا سے کرنا چاہئے تھا۔ پوچھنا چاہئے تھا ان سے بلکہ میرے ساتھ چلو اور چل کر ان سے پوچھو مگر تم میں اتنی ہمت کہاں کہ تم ان کے سامنے کھڑی ہو کر بات کر سکو۔" وہ اسے چیلنج کر رہا تھا۔

"میں تمہارے گھر دوبارہ کبھی جانا چاہتی ہوں نہ تمہارے باپ کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔" وہ اس پر غرائی تھی۔

"اگر تم میرے باپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھیں تو پھر تم نے میرا پرپوزل قبول کیوں کیا؟ مجھ سے نکاح کیوں کیا۔ میرے ساتھ۔" سارہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"تب تک مجھے حقیقت کا پتا نہیں تھا اور مجھے سب کچھ پہلے پتا چل جاتا تو تمہارے ساتھ نکاح تو دور کی بات ہے، میں کبھی تمہارے باپ کے پاس بھی نہ جاتی۔ میں کبھی اس شخص کے پاس جانا پسند نہ کرتی جس نے میری ماں کی زندگی برباد کر دی جس نے ان کو بے عزت کیا۔"

"سارہ! تم یہ بات مت کہو، تمہیں یہ بات کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں تمہاری امی کہہ سکتی تھیں کیونکہ ان پر ظلم ہوا تھا اور انہوں نے کسی سے اس کا بدلہ نہیں لیا تھا مگر تم بدلہ لے چکی ہو۔ تم نے مجھے بے عزت کیا ہے اگر تمہاری ماں بے قصور تھیں تو مجھے بتاؤ۔ میں نے کون سا گناہ کیا تھا۔ کیا تم نے سوچا تمہارے اس طرح چلے جانے سے میں لوگوں کے سامنے تماشا بن کر رہ جاؤں گا؟ نہیں، تم نے نہیں سوچا بالکل اسی طرح جس طرح میرے دادا، دادی نے نہیں سوچا تھا۔ اسی طرح جس طرح میرے باپ نے نہیں سوچا تھا۔ تم میں اور ان میں کیا فرق ہے، بتا سکتی ہو تو بتاؤ؟"

وہ ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری امی کا دل مرنے کو چاہا ہوگا۔ میرا دل بھی چاہا تھا میں خودکشی کر لوں تمہاری امی مظلوم تھیں۔ تم مظلوم نہیں ہو۔"

"میں نے تم سے یا کسی سے بھی کوئی بدلہ نہیں لیا۔ میں بس تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تمہارے گھر آنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں وہاں سے بھاگ آئی۔"

یہ میں نے بعد میں سوچا تھا کہ اس سے۔"

حیدر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "دادا نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی پر ظلم کیا۔ دادی نے بھی یہ بعد میں سوچا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی کو رسوا کر دیا، پاپا کو بھی یہ بعد میں خیال آیا تھا کہ انہوں نے تمہاری امی کی زندگی برباد کر دی۔ اگر تم اپنے اس اقدام کو justify (جائز) کرتی ہو تو ان کو بھی کرو، کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے نہیں سوچتا کہ وہ غلط کام کر رہا ہے۔ ہر ایک بعد میں ہی سوچتا ہے۔ وہ تم ہو، پاپا ہوں یا دادا، دادی۔"

سارہ نے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟"

"بہت کچھ، یہ کہ تم پاپا کو معاف کر دو اور یہ کہ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں دونوں کام نہیں کر سکتی۔" اس نے قطعی انداز میں جواب دیا تھا۔

"پھر تیسرا کام میں کر سکتا ہوں یعنی تم کو طلاق دے دوں۔"

سارہ نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"دے دو۔"

وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا تھا۔ "طلاق لے کر کیا کرو گی؟ کیسے رہو گی؟ زندگی کیسے گزارو گی؟"

"ویسے ہی گزاروں گی جیسے میری ماں نے گزاری تھی۔"

"یہی تو مشکل ہے سارہ! کہ تم اپنی امی کی طرح زندگی نہیں گزار سکتیں۔ میں تمہاری امی کے بارے میں وہی کچھ جانتا ہوں جو میں نے لوگوں سے سنا ہے لیکن مجھے لگتا ہے میں ان کو کسی سے بھی بہتر سمجھ سکتا ہوں تم سے بھی بہتر حالانکہ میں نہ کوئی سائیکالوجسٹ ہوں نہ مجھے لوگوں کو سمجھنے کا شوق ہے۔ لیکن پچھلے دو ماہ سے میں ان کے

بارے میں اتنا سوچ رہا ہوں کہ ان کو پسند کرنے لگا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کوئی اتنا صبر، اتنا ایثار کر سکتا ہے جتنا انہوں نے کیا۔ پاپا کو لگتا ہے کہ صبا نے ان سے بہت محبت کی تھی اور جب انہوں نے انہیں چھوڑ دیا تو پھر صبا نے دنیا ترک کر دی مگر مجھے ایسا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری امی کا اور خدا کا ایک بہت خاص رشتہ تھا۔ انہیں صرف خدا کے ہونے پر یقین نہیں تھا۔ یہ بھی اعتماد تھا کہ جو کچھ انہیں مل رہا ہے اس کی وجہ سے ہے اور انہیں لگتا ہوگا کہ خدا نے ان کے گرد ایک حفاظتی دیوار ایک حصار کھینچا ہوا ہے۔ انہیں یہ زعم ہوگا کہ وہ خدا سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ وہ کبھی اس حصار کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔ لیکن ہوا کیا میرے دادا، دادی تمہاری امی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پاپا کے مجبور کرنے پر انہوں نے تمہاری امی سے ان کا نکاح کیا تھا۔ دادا نے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس رشتے کو قبول کر لیا لیکن دادی نہیں کر پائیں اور پھر وہی عورت کی ازلی رقابت اور سازش، پھر ایک کے بعد ایک ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے تمہاری امی کو متزلزل کر دیا۔ انہیں یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ سب ان کے ساتھ ہو سکتا ہے اور تابوت میں آخری کیل میرے پاپا نے طلاق دے کر گاڑ دی۔ تمہاری امی کو لگا عارفین عباس نے نہیں خدا نے انہیں چھوڑ دیا اور پھر ساری زندگی وہ خدا کو منانے کی کوشش کرتی رہیں اور تمہیں پتا ہے ایسے لوگ میرے تمہارے جیسے دنیادار لوگوں کے لئے کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کو منا کر رکھیں تو ان کا غلام بن جانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کو تکلیف پہنچائیں تو اللہ سکون چھین لیتا ہے۔ جیسے میرے پاپا کے ساتھ ہوا یا میرے خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوا، میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ انہیں خوش یا مطمئن نہیں دیکھا جیسے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں رہی۔ کامیاب بینکر، اچھی خوبصورت بیوی، اولاد، دولت، عزت ان کے پاس کیا تھا جو نہیں رہا۔ ہاں بس سکون نہیں تھا نہ اب ہے۔"

وہ اس طرح اسے سب کچھ بتا رہا تھا جیسے وہ اس کی بہترین دوست ہے جیسے وہ یہی سب بتانے کے لئے وہاں آیا ہو، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتیں سنتی گئی۔

"اور وہ اکیلے اس اذیت کا شکار نہیں تھے۔ ہمارے خاندان کے ہر فرد کو اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دادا کو، دادی کو، پھوپھو کو، میری ممی کو اور اب مجھے اور میں چاہتا ہوں یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ تمہاری امی نے اللہ سے اتنی محبت کی کہ پھر اس کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں کی مگر سارہ! تمہارا خدا کے ساتھ ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تم کبھی صبا کریم جیسی قناعت حاصل نہیں کر سکتیں۔ تم گھر چھوڑ سکتی ہو، دنیا کو نہیں تمہاری امی تمہاری طرح کسی اکیڈمی میں نہیں گئیں نہ انہوں نے اپنے سرٹیفکیٹس حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ انہوں نے اب کسی materialistic pursuit میں شریک نہیں ہونا تھا اور تم، تم نہ دنیا چھوڑ سکتی ہو نہ خدا کو۔ کچھ وقت گزرے گا پھر تمہیں پچھتاوے ہونے لگیں گے اور میں چاہتا ہوں اس وقت سے پہلے تم واپس آ جاؤ تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ تمہاری امی نے تمہیں میرے پاپا کے پاس بھجوا دیا تھا۔ ان کی یہ خواہش ہو گی کہ تم ان جیسی زندگی نہ گزارو، عام لوگوں کی طرح نارمل زندگی گزارو۔ اپنے ماضی سے بے خبر رہ کر اسی لئے انہوں نے تمہیں اپنے بہن بھائیوں کے پاس نہیں بھیجا۔ انہیں خدشہ ہوگا وہ ان کے اور تمہارے ماضی کو چھپا کر نہیں رکھیں گے اور یہ باخبری تمہیں ساری عمر تکلیف دیتی رہے گی۔ میرے پاپا یہ کام کر سکتے تھے سو انہوں نے تمہیں ان کے پاس بھجوا دیا۔ تمہارے نانا، ماموں اور خالہ نے تمہیں ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی۔ تم نہیں ملیں۔ ایک ماہ پہلے وہ واپس چلے گئے۔ اب تمہیں صرف میں اور پاپا ڈھونڈ رہے تھے۔"

سارہ نے ایک بار پھر اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"تم سے میں ایک بار پھر کہوں گا۔ میرے ساتھ گھر چلو، پاپا سے ناراضگی ہے، ان

سے لڑو، جو کہنا ہے کہہ دو۔ مجھ سے اگر کوئی شکایت ہے تو کرو لیکن میرے ساتھ چلو۔"

وہ چہرہ چھپائے بے آواز رو تی گئی تھی۔

"ہاں۔ تم نے سچ کہا۔ مجھے ای کی طرح دنیا میں رہنا نہیں آرہا نہ کبھی آسکتا ہے۔ ای کی طرح زندگی گزارنا بہت مشکل ہے اور میں۔ میں بہت کمزور ہوں۔"

وہ روتی ہوئی دل ہی دل میں اعتراف کر رہی تھی۔

دور کہیں سائرن بجنے لگا تھا۔ پھر اذان ہونے لگی۔ حیدر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تپائی پر رکھے ہوئے لفافوں کو کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے ایک کھجور نکال کر روزہ افطار کیا تھا۔

گل اور عذرا اندر آگئی تھیں۔

"اس کو پھر دورہ پڑ گیا؟" گل نے سارہ کو دیکھتے ہی بے اختیار کہا تھا۔ حیدر نے شاپر سے ایک کیلا نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

"سارہ! روزہ تو افطار کر لو۔" عذرا کچن سے ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں رکھ کر اس کے پاس آگئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا تھا اور آستینوں سے چہرہ خشک کرنا شروع کر دیا پھر اس نے پلیٹ میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی اور کھڑی ہو گئی، بستر پر رکھے ہوئے بیگ کو اس نے کندھے پر ڈال لیا تھا۔ حیدر مسکرایا اور اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا اس نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ تھما دیا۔

"تم جا رہی ہو تو اپنا سامان تو لے جاؤ۔" عذرا اسے جاتے دیکھ کر چیخی تھی۔

"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ خدا حافظ۔" اس نے دروازہ پار کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے کسی ننھے بچے کی طرح وہ اس کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔

"پچھلے دو ماہ سے میں اپنی پوری سیلری تمہیں ڈھونڈنے پر خرچ کر رہا ہوں بلکہ

اکاؤنٹ میں جو تھوڑے بہت روپے تھے وہ بھی خرچ کر چکا ہوں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔ اس لئے اب تمہیں چند سال اور میری طرح پاپا پر انحصار کرنا پڑے گا۔ حد سے زیادہ چھٹیوں پر بینک والوں کی طرف سے بھی ایک وارننگ لیٹر مل چکا ہے۔ تم نے مجھے صحیح معنوں میں خوار کیا ہے۔"

اس کا ہاتھ تھامے نیم تاریک سیڑھیوں میں اس کے آگے چلتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" سارہ کو یک دم خیال آیا۔

"میں جانتا تھا کہ اگر تم ہاسٹل میں نہیں تو پھر اسی طرح کے کسی فلیٹ میں ہو گی۔ تم کسی بڑے پراپرٹی ڈیلر کے پاس تو جا نہیں سکتی تھیں۔ اس لئے ظاہر ہے کسی چھوٹے موٹے پراپرٹی ڈیلر کے پاس ہی جاتیں۔ پولیس نے تمام چھوٹے موٹے پراپرٹی ڈیلرز کو کانٹیکٹ کیا اور تمہارے بارے میں معلومات لینا شروع کیں۔ بالآخر ایک کے ذریعے تمہارا اتا پتا مل گیا پھر آج دوپہر کو ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ تمہارے ساتھ رہنے والی لڑکیوں کو تمہاری فیکٹری کا پتہ نہیں تھا ورنہ میں سیدھا وہیں آتا۔" وہ کہتا گیا تھا۔

"حیدر زیادہ باتیں نہیں کرتا، بہت ریزرو ہے بلکہ یہ کہہ سکتی ہو کہ کم گو ہے۔ وہ کسی سے زیادہ بے تکلف بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب اس کی عادتوں میں شامل ہے۔" عارفین عباس نے ایک بار اسے حیدر کے بارے میں بتایا تھا۔

سارہ نے اس "کم گو" کو دیکھا جو اس کا ہاتھ تھامے سیڑھیاں اترتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔

"مجھے اکثر چیزوں کا پتا بعد میں چلتا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "جیسے یہ کہ تمہاری ای اور پاپا کا اصل رشتہ کیا تھا؟ وہ کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا تھا یا یہ کہ میں اگر ہر دفعہ تم تک پہنچنے میں ناکام ہو جاتا تھا تو اس کی وجہ میری گاڑی تھی جس کی موجودگی نے ہر دفعہ تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا یا پھر یہ کہ۔ کہ میں تم سے محبت کرنے لگا تھا اور یہ کہ یہ

محبت یکطرفہ نہیں تھی۔"

سارہ کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی تھی۔

"ہاں اور یہ بھی کہ تم فرنچ جانتی تھیں۔" وہ یک دم فرنچ بات کرنے لگا تھا۔

"اس لاعلمی سے مجھے کیا نقصان پہنچا۔ یہ تم مجھے گھر پہنچ کر بتانا۔" وہ سیڑھیاں اتر کر عمارت سے باہر آگئے تھے۔

اوئے ہوئے! ٹائی ٹینک کا ہیرو اور ہیروئن جا رہے ہیں۔"

پاس سے گزرتے ایک لڑکے نے سیٹی بجاتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔ حیدر نے جھینپتے ہوئے بے اختیار اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سامنے سڑک پر بہت رش تھا۔ زندگی کا رستہ اتنا ہی صاف نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آسمان پر چاند دیکھنے کی پہلی کوشش کی تھی۔